JANUARY
2024

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

2024 سالِ نو مبارک

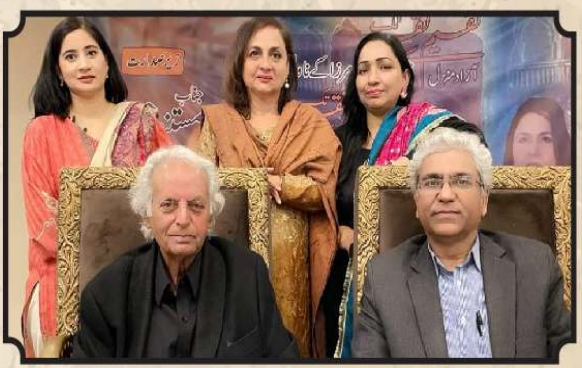

جناب مستنصر حسین تارڑ، جناب غافر شہزاد، محترمہ ثمینہ سید، محترمہ فرحت زاہد، محترمہ آمنہ مفتی

محترمہ نیلم احمد بشیر، جناب غافر شہزاد

جناب افتخار عارف، جناب غافر شہزاد

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

جس کی ہر بات میں صناعی ہو
وہ یہ بے ساختہ پن کیوں دیکھے

درد کے چاند کہاں ڈھلتے ہیں
ہجر کا چاند گہن کیوں دیکھے

لوگ چاہت کی حرارت مانگیں
کوئی یہ رنگِ سخن کیوں دیکھے

بات کوئی بھی زمانے کی نہیں
زندگی میرا چلن کیوں دیکھے

سلوٹ اُبھری کہ ستارہ ٹوٹا
کوئی ماتھا یہ شکن کیوں دیکھے

چاند ہے سر سے گزر جائے گا
وہ ٹھہر کے مِرا بن کیوں دیکھے

نیم وا گُل ہیں کہ لب ہیں خالد
یہ مِرا غنچہ دہن کیوں دیکھے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32- جنوری 2024- شمارہ نمبر: 1

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب ڈاکٹر غافر شہزاد

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد نیاز بیگ اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، صفدر صدیق رضی، طالب انصاری	8 تا 14
		محمد افضال انجم، فیض رسول فیضان، نبیل احمد نبیل	
3	عقیدت	مرزا آصف رسول، آسناتھ کنول	15 تا 16
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	17 تا 20
5	گوشہ ڈاکٹر عاقر شہزاد	فن و شخصیت + افسانہ نگاری	21 تا 22
		عاقر شہزاد کا تخلیقی سفر	23
		افسانے	24 تا 30
		اہل فن کی مختصر آرا	31 تا 32
		عاقر شہزاد کی شاعری	33 تا 34
		غزلیں	35 تا 40
		عاقر شہزاد کی ناول نگاری	41 تا 51
6	افسانے	اسلام عظمی، بلقیس ریاض، محمد طارق علی، کلیم خاوری، احمد سبحانی آکاش	52 تا 93
		ناصر علی سید، آسناتھ کنول، اجمل اعجاز، نغمانہ صدیقی	
7	مضامین	سید افسر ساجد، نظیر ساگر، ظفر معین بلے جعفری، یعقوب نظامی	94 تا 132
		طاہر یاسین طاہر، خالق آرزو، صدام ساگر، ثوبیہ ارشد	
		عائشہ کلثوم ، نسیم سکینہ صدف، فیصل عظیم	

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، انور شعور، راحت سرحدی، گلزار بخاری، محمد انیس انصاری، سعد اللہ شاہ، ممتاز اطہر، شاہنواز زیدی، نثار ترابی، اقبال سروب، محسن اسرار، احمد حسین مجاہد، تابش کمال، مسعود احمد، افروز رضوی، رخشندہ نوید، رحمان حفیظ، احمد سجانی آکاش، شوکت محمود شوکت، احمد جلیل، نیز سرحدی، مقصود جعفری، شبہ طراز، نبیل احمد نبیل، محمد نوید مرزا، محمود کیفی، محمد سلیم ساگر، اجمل اعجاز، انصر حسن، دانش عزیز، جاوید قاسم، آفتاب خان، اعجاز روشن، اعجاز دانش، ذکی طارق، محمد اشفاق بیگ، افتخار شوکت، علی ارمان، شاہد ماکلی، رانا سعید دوشی، ظفر علی راجا، ریاض ندیم نیازی، عابد معروف مغل، فرح رضوی، اکرم جاذب، عمران اعوان، ظہور چوہان، عاصم اعجاز، فیصل زمان چشتی، صغیر احمد صغیر، محمد نور آسی، بشیر احمد حبیب، رخسانہ سمن، نعمان محمود، محمد علی ایاز، افضل ہزاروی، اکرام الحق سرشار، راجہ عبدالقیوم، مستحسن جامی، محمد امین صادق، عقلین جعفری، احمد محمود، ساگر حضور پوری، اظہر کمال، روا حاصل خلوص، تاج الدین تاج، جیا قریشی، اسد رضا سحر، سرفراز عارش، کوکل گل، عنبرین خان، علی آرش، عبدالرؤف زین، عروج درانی، رانا محمد شاہد، جنید نسیم سیٹھی، شمسہ نورین، آمنہ روشنی رشنا، طلحہ غفور، شمسیلہ سعید	133 تا 213
9	طنز و مزاح / خاکے	محمد کلیم	214 تا 215
10	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	216 تا 224
11	نظمیں	خالد احمد، ریاض مجید، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، رانا سعید دوشی، افتخار شوکت، ظفر علی راجا، سید تحسین گیلانی، نوید صادق، مرزا عاصی اختر، صغیر احمد صغیر، امجد بابر، عاطف جاوید عاطف، نائلہ راٹھور، زاہد خان، رافعہ ارم مرزا، محمد عبداللہ	225 تا 241

حمد

ایک چڑیا جو چہچہا رہی ہے
نغمۂ حمد گنگنا رہی ہے

تیرے دستِ ہنر کی صناعی
آسمانوں پہ جگمگا رہی ہے

رحمِ مادر میں تیری خلاقی
نو بہ نو صورتیں بنا رہی ہے

تیری قدرت کا رنگ ہے وہ کلی
جو سرِ شاخ مسکرا رہی ہے

کہیں جگنو کے تن میں شان تری
روشنی بن کے ٹمٹما رہی ہے

دھڑکنوں کی روانی ٔ پیہم
تیری جانب ہمیں بلا رہی ہے

پھول کو رنگ کون دیتا ہے
اس میں خوشبو کہاں سے آ رہی ہے

پھول کے رس کو چوس کر مکھی
شہد کیسے اسے بنا رہی ہے

صبغۃ اللہ کے نقش کیا ہوں گے
ایک تتلی نظر کو بھا رہی ہے

تیری رحمت ہے جو سر قرطاس
حرف کو روشنی بنا رہی ہے

تجھ سے دوری ہمیں زمانے میں
بدنصیبی کے دن دکھا رہی ہے

دیکھ سرور خدا کی جلوہ گری
ذرے ذرے میں جھلملا رہی ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

حاصل ابھی یہ سطحِ سعادت نہ ہو سکی
اک سطر حسبِ شانِ رسالت نہ ہو سکی

آہنگِ صبح و شام میں کیا دل کے کام کی
دھڑکن جو اسؐ کے نام کی نوبت نہ ہو سکی

اس رحمتِؐ زمین و زماں کا کمالِ خُلق
دشمن کے ساتھ بھی کبھی نفرت نہ ہو سکی

جو جستجو نہ اُس درِ عرفاں سے مَس ہوئی
وہ آشنائے روحِ حقیقت نہ ہو سکی

اُس دل پہ کیوں نہ بابِ شفاعت بھی بند ہو
جس کو پسِ گناہ خجالت نہ ہو سکی

نسبت ہمیں حنین و حرا سے ہے سو کبھی
حاوی دلوں پہ دہر کی دہشت نہ ہو سکی

ذاتِ نبیؐ کے ساتھ جو امّت میں بات تھی
پیدا وہ بعدِ عہدِ نبوت نہ ہو سکی

عالی نہ ہو خدائے محمدؐ جو دھیان میں
سمجھو درست ہم سے عبادت نہ ہو سکی

جلیل عالی

نعتؐ

اِک نُور بخش رات ملے اور نعت ہو
کاغذ، قلم، دوات ملے اور نعت ہو

اِک ذرّہ کائنات کا ہوں، اور دُعا یہ ہے
مجھ کو بھی کائنات ملے اور نعت ہو

آقاؐ حضور، آپؐ کے در پر کھڑا ہوں مَیں
منگتا ہوں مَیں، زکوٰۃ ملے، اور نعت ہو

اے کاش، میری نعت ہو کچھ ایسی منفرد
ہر لفظ کو ثبات ملے اور نعت ہو

رزقِ سخن کی کوئی کمی تو نہیں حضورؐ!
یہ رزق تاحیات ملے اور نعت ہو

کب تک رہوں گا صنفِ غزل کی گرفت میں؟
اِس قید سے نجات ملے اور نعت ہو

اُنؐ کے رُخِ جمیل کی ہو اِک جھلک نصیب
ذوقِ جمالیات ملے اور نعت ہو

دیدارِ اُنؐ کا خواب میں مُجھ کو بھی ہو نصیب
اِک لمحۂ نشاط ملے اور نعت ہو

میں ہوں دعا گزار درِ آں حضورؐ پر
کچھ اُن کا التفات ملے اور نعت ہو!

پہچان کا حوالہ مری نعت ہو نسیمؔ
مجھ کو بھی اذنِ نعت ملے، اور نعت ہو

نسیمِ سحر

نعتؐ

ذہن میں کتنے لفظ ہیں لیکن خالی ہیں صفحات
نعت سے پہلے حمد لکھوں یا حمد سے پہلے نعت

وہ جب لکھوائے تو لکھوں فرمائے تو عرض کروں
اہلِ ہنر کو جو کرتا ہے کارِ ہنر خیرات

اس پر ختم ہے دانش و حکمت' منصب و جاہ تمام
اس کی ٹھوکر میں اسکندر قدموں میں سقراط

اس کے اک اقرار کے آگے سر بہ سجود انکار
اور اس کی اک نفی پہ قرباں لامحدود اثبات

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک سطر میں ہوئے ورقِ جان و تن تمام
لیکن ہوا نہ تذکرۂ پیرہن تمام

نعتؐ

رفعتِ عشق کو جاتا ہوا زینہ مرا سینہ
نعت کے صدقے بنا سبز نگینہ مرا سینہ

آپؐ کی یاد ہے نکہت بھری گلیوں کی سیاحت
آپؐ کے ذکر سے بنتا ہے مدینہ مرا سینہ

دف کی پرکیف صداؤں سے سدا گونجتا ہے دل
ہجرتِ ارضِ مدینہ کا مہینہ مرا سینہ

کس طرح غارِ حرا بنتی ہے بے کار سی یہ شے
تو کبھی دیکھ لے آ کر مرا سینہ مرا سینہ

موج در موج عقیدت کے سفر پر یہ رواں ہے
ساحلِ ارضِ مقدس کا سفینہ مرا سینہ

تذکرہ سرورِ عالم کا کلیدِ در دل ہے
جذبۂ مدحِ پیمبرؐ کا خزینہ مرا سینہ

فرطِ تعظیم سے دل دیکھتا ہے غارِ حرا کو
ساتھ رکھتا ہے عقیدت کا قرینہ مرا سینہ

طالب انصاری

نعتؐ

ستارہ میرے مقدر کا جگمگائے حضورؐ
ہمیشہ میں تو رہوں بن کے آشنائے حضورؐ

انہیؐ کا ذکر رہے صبح و شام ہونٹوں پر
ادا نہ کچھ ہو زباں سے بجز ثنائے حضورؐ

جو نیند میں بھی تصور رہے مدینے کا
تو اس کو کیسے نہیں جانیے عطائے حضورؐ

یوں ایک دن ہو، کہ شہرِ نبیؐ میں جا پہنچوں
میں چوم چوم لوں پلکوں سے نقشِ پائے حضورؐ

سوال مجھ سے کریں لوگ جب مدینے کے
بتاؤں کچھ بھی نہ خود کو بجز گدائے حضورؐ

ادب سے نظریں جھکا کر ہو حاضری میری
حضوریوں کی بھی لذت یہ دل اُٹھائے، حضورؐ

رہے، دعا ہے قرینہ، ادب کا، الفت میں
جو حاضری میں مری آنکھ ڈبڈبائے، حضورؐ

میں آپؐ ہی کے تصور سے جڑ کے زندہ رہوں
ہوں دور دل سے مرے درد و غم کے سائے حضورؐ

ہم اپنے اشکوں سے دھو ڈالیں داغ عصیاں کے
ہمارا مقصد و مطلب ہو بس رضائے حضورؐ

بنا ہے آپؐ کا انجم تو آپؐ ہی کا رہے
جز آپؐ کے نہ کسی در پہ سر جھکائے حضورؐ

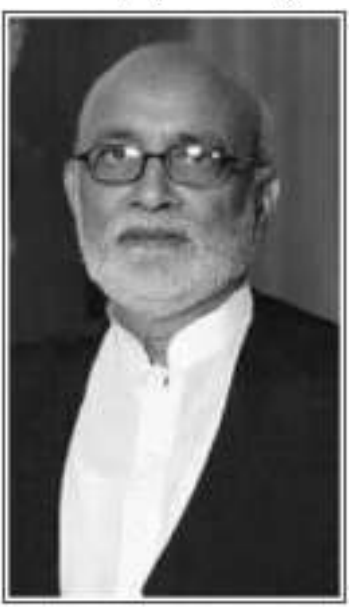

محمد افضال انجم

نعتؐ

(زمین خالد احمد)

میں نے جب بھی شہِ کونین کی مدحت لکھی
ذات نے میرے لئے عزت و عظمت لکھی

خود بھی ہے کاتبِ تقدیر ، سراپا حیرت
اپنے محبوب کی ، مولا نے وہ رفعت لکھی

اب بھی اُس پر ''ورفعنا لک ذکرک'' ہے گواہ
پیارے احمدؐ کی احد نے ہے جو شہرت لکھی

موردِ آیہء تطہیر ، نبی کا گھر ہے
کیسی ، اللہ نے بے مثل طہارت لکھی

اللہ اللہ! یہ خوش بختیء اصحابؓ رسول
حق نے جن کے لئے محبوب کی صحبت لکھی

صدقہ سیّدِ لولاک، خدا نے دیکھو
عاصیوں کے لئے کیا کیا نہیں نعمت لکھی

منکروں کے لئے دوزخ کا الاؤ ، توبہ!
عاشقوں کے لئے جنت کی بشارت لکھی

دھڑکنوں کے لئے جذبات مدینے والے
آنسوؤں کے لئے تصویرِ زیارت لکھی

کون پہنچا شبِ معراج کی تہ تک فیضانؔ
کس نے سرکارِ دو عالم کی حقیقت لکھی

فیض رسول فیضان

نعتؐ

رہا ہر دور میں دستِ سخاوت دیکھنے والا
رسولؐ اللہ کا حُسنِ عنایت دیکھنے والا

بلا چُون و چرا ایمان لے آیا نبوت پر
شہِ ابرار کا طرزِ محبت دیکھنے والا

وہی ہیں رافعِ حاجت وہی ہیں شافعِ محشر
مرے آقاؐ کا ہے حُسنِ شفاعت دیکھنے والا

جدھر پاؤں اُٹھیں منزل کے رستے کُھلتے جاتے ہیں
شہِؐ دیں کا ہے اندازِ قیادت دیکھنے والا

بلا کی تیرگی میں بھی وہ رستہ دیکھ سکتا ہے
سفر میں آپؐ کا نورِ بصارت دیکھنے والا

غلامِ مصطفےٰ ہوں اُنؐ کے در کا میں گدا گر ہوں
مرے جذبوں کو ہے وہ ربِّ عزّت دیکھنے والا

کسی گمراہ رستے کو بھٹک سکتا نہیں ہرگز
نبیل اُس حُسن کا حُسنِ صداقت دیکھنے والا

نبیل احمد نبیل

ثنائے زریں

فکرِ مفلس پہ ہے کیا رب کی عطائے زریں!
ہے سخن مدحِ محمدؐ میں ثنائے زریں

خوشبوئے صلِ علیٰ جس کو مدینے سے ملے
زرِ جنت سے نہیں کم وہ نوائے زریں

حق جو تھا فاتبعونی کا سرِ عشق و وفا
کھا گیا اس کو زمانے کا ریائے زریں

تھام کر امتِ مرحوم نے بدعت کے علم
کھو دیا سیرت و سنت کا لوائے زریں

حبس آلام کا بڑھنے لگا ہر سو آقا!
آئے پھر طیبہ سے مُردوں کی ہوائے زریں

آج پھر ہو کرم، اے میرِ امم! یوں ہم پر
جیسے یثرب کو عطا کی ہے فضائے زریں

عقل و ہوش اپنی جگہ حضرتِ خواجہ میں مگر
تصفیہ قلب و نظر کا ہے صفائے زریں

کاش تعبیر مدینے میں ہو سب کی، ہم نے
خواب آنکھوں میں ہیں جتنے بھی سجائے زریں

روضے پہ آئیں ہیں بس اشکِ ندامت لے کر
ارمغاں اور کوئی ہم نہیں لائے زریں

زینتِ جامۂ تقویٰ ہے محمدؐ سے وفا
کیوں نہ پھر قول و عمل کو کیا جائے زریں

قصرِ اسلام کے جتنے بھی ستوں ہیں آصف!
ہے محمدؐ سے وفا دیں کی بنائے زریں

مرزا آصف رسول

عقیدت [مالک کون ومکاں]

جہاں جہاں بھی ہیں یہ آسمان اُس کے ہیں
زمین ہی نہیں سارے جہان اُس کے ہیں

مقام اس کا ہے ارفع و ماورئ سب سے
تمام سلسلے شایانِ شان اُس کے ہیں

ہمیں وہ آج بھی تقسیم کر رہا ہے حیات
یقین ہی نہیں وہم و گمان اس کے ہیں

کسی بھی شے کو اگر ہے ثبات اُس سے ہے
فضائیں اس کی ہیں کون و مکان اس کے ہیں

وفا کو چھوڑ کر اس کی کنول کہاں جاؤں
کہ روز و شب مرے لب پر بیان اس کے ہیں

آسناتھ کنول

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

گُل بن دیارِ علم کے پیروں کی گرد تھے
اک رنگ میں چنار ہوئے خار بن تمام

دل اور دلائل

کیا دلنشیں انداز تھا ان کا دل و نگاہ واہ واہ
سرِ راہ چاہ ہی چاہ کر اُٹھے کہہ اُٹھے کہنے کو تو

وہ ایک بزنس مین ہیں مگر خود کو مزدور سمجھتے ہیں ٹھیک ہی سمجھتے ہیں کہ جو بھی محنت کرے اپنا وقت بیچے وہ ڈاکٹر ہو یا انجینئر ارب پتی کاروباری ہو یا گندم کی بوریاں اُٹھانے والا محنت کش ہو یہ سب مزدور ہی ہوتے ہیں مذکورہ بالا شخص سے واقف ہی نہ تھا کسی ملنے والے نے ان کا ذکر کیا ان کی باتیں کیں اور کہا وہ کہتے ہیں:

''دل صفائیاں ہوں تو ہمارے حالات بدلیں گے''

بات پتے کی تھی کہ بات کا پتہ مل رہا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا اُس ملنے والے سے پوچھا ''اس طرح کی بات عام آدمی نہیں خاص انسان ہی کر سکتا ہے۔ آپ دل صفائیاں والے اس خوش خصال انسان کو مجھ سے ملوا سکتے ہیں؟''

یوں اک رات ان سے ملاقات ہو گئی پھر بات ہو گئی اور غمِ دوراں کو مات ہو گئی کہ غمِ جاناں تو اک جائیداد ہے خزانہ ہے پراپرٹی ہے اور وہ اس پراپرٹی کے ڈیلر تھے انھوں نے بیرون ملک بھی بہت عرصہ گذارا اب پاکستان میں چھوٹا موٹا کاروبار تھا ان کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں دوست بتاتے ہیں رمضان میں اعتکاف بیٹھے کچھ اور دوست بھی ساتھ تھے۔ سب کا کھانا گھر سے آتا تھا ۔ معتکف اپنی اپنی جگہ کھانا کھاتے تھے انھوں نے ترغیب دی تو سب کے ''چھابے'' اکٹھے ہو گئے۔

میں سوچ رہا تھا اسی طرح دنیا میں اب 61 ممالک ایسے ہیں کہ جن کے یا تو سربراہ مسلمان ہیں یا ان کی 97 فیصد سے زائد آبادی مسلمان ہے تو اکٹھے مسلم ممالک کے چھابے اگر اکٹھے ہو جائیں تو کیسا رہے؟ اک مسلم بلاک بن جائے ان کی کرنسی ایک ہو مفادات ایک ہوں ٹریڈ ایک ہو تو نیل کے ساحل سے تا بخاک کا شعر سب ایک بھی ہو سکتے ہیں۔

سلیمان عبداللہ ڈار

کیا سب مسلمانوں کے چھابے ایک ہو سکتے ہیں؟'' میں نے اپنے انہی صاحب دل دوست سے پوچھا:

''ہاں ہو سکتے ہیں اگر مسلمان اک دوسرے کو دل دیں دلائل نہ دیں۔ ہمیں تو فرمایا گیا تھا تم سب جسدِ واحد ہو انگلی پر زخم ہو تو آنکھ روتی ہے حالانکہ آنکھ پر نہ زخم ہوتا ہے نہ درد۔ مسلم اُمہ کے جسد واحد کے عالمی دہشت گردوں نے 61 ٹوٹے کر دیے قیمہ کر کے رکھ دیا گیا''

''اصل بات تو یہ ہے کہ ہادی برحق نے اللہ کے نزدیک کیا تھا ہم اس سے دور ہو گئے تو دنیا کے ہر میدان میں فیل ہوئے وہ گم گشتہ عروج کیسے حاصل ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جو پاس رہے گا وہی پاس ہو گا صحابہ کرامؓ کے دور میں اس وقت کی سب سے تربیت یافتہ اور حرب وضرب کی ماہر فوج رومتہ الکبریٰ کی تھی مگر قوت ایمانی سے لبریز 8 ہزار صحابہ نے ڈیڑھ لاکھ رومی فوجیوں کو عبرتناک شکست دی''

''کیا خواہشات کی کثرت نے عروج سے زوال کی طرف دھکیلا؟'' ''جی ہاں۔ خواہش ہی ہم پر حکومت کرتی ہے خواہش ہی محکوم بناتی ہے''

''زندگی کے دُکھ کیسے دور ہوں گے'' میں نے پوچھا

''وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر گویا ہوئے

''زندگی میں کبھی انسان کے ساتھ مسرت کا غم ہوتا ہے اور کبھی غم کی مسرت''۔

''میں سمجھا نہیں

''یوں سمجھیں کہ زندگی میں

☆ بعض اوقات ڈوبنے والا اُبھر جاتا ہے اُبھرنے والا ڈوب جاتا ہے

☆ بعض اوقات کمزوری قوت بن جاتی ہے یا قوت کمزوری بن جاتی ہے

☆ کبھی جلال جمال کے سامنے سرنگوں کبھی جمال جلال کے آگے سجدہ ریز۔

☆ تلاش کی ضرورت اور ضرورت کی تلاش سے ہی امت مسلمہ اُبھر سکتی ہے''

''تو پھر مسلمان کو کیا کرنا ہو گا؟ میں نے مزید پوچھا:

''کائنات کی فکر دراصل فکر کی کائنات ہے صحابہ نے پوری انسانیت کے لئے سوچا کہ اللہ کا سچا دین دنیا میں عام ہو جائے۔ مال غنیمت یا کشور کشائی ان کا مقصد نہ تھی،،

میرے دل میں یہ بات آئی کہ بندہ عموماً کوشش تو کرتا ہے مگر خواہشات کا گھوڑا ضمیر کو روند کر گزر جاتا ہے اقوام عالم میں سرداری اور مرتبہ کیسے ملے گا؟ یہ تو اس وقت ہی ملے گا جب صحابہ کرامؓ کی طرح سرداری مرتبہ اور مسند کی چاہ دل سے نکل جائے۔ جیسا اب حال ہے کہ جن نام نہاد قائدین

کے بینر عوام اُٹھائے پھرتے ہیں اور جن پر لکھا ہوتا ہے۔ نہ بکنے والے نہ جھکنے والے نڈر بے باک علیٰ ہذا القیاس۔ یہ لیڈر بک بھی جاتے ہیں جھک بھی جاتے ہیں نہ ہی یہ نڈر ہوتے ہیں نہ ہی بے باک۔

جس دور میں بادشاہوں کا کہا ہوا ہی قانون کہلاتا تھا وہ بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیا کرتے تھے بے گناہوں کو تختہ دار پر لٹکانا اور قتل و غارت گری ان کا مشغلہ ہوا کرتا تھا اس دور میں بھی صحابہ نہ قیصر سے ڈرتے نہ کسریٰ سے رستم کے دربار میں بھی حضرت مرارہؓ بن ربیع نے بندوں کو خدا سے ملانے کی دعوت دی اور ظاہر حالت ان کی یہ تھی کہ تلوار کے لئے نیام بھی میسر نہ تھا۔ اُسے چیتھڑوں میں لپیٹا ہوا تھا۔

وزراء اور مشیروں نے مشورہ دیا کہ (معاذ اللہ) یہ وحشی قوم کے لوگ ہیں بھوک نے ستایا تو یہاں آ گئے مگر رستم نے کہا کہ ان کی آنکھوں کی چمک اس قوت ایمانی کا پتہ دے رہی کہ جس کے بل بوتے پر یہ لوگ میرے قدموں تلے کی زمین کے مالک بن جائیں گے آج ہر فرد اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجد بنا کر اسلامی انقلاب کا داعی بن رہا ہے اور جس ایمان جس یقین جس تعلق کی ضرورت ہے جو اپنے اللہ کے ساتھ مقصود ہے ایک تو وہ موجود نہیں دوسرا یہ تعلق پیدا ہو جائے اس لئے کوئی عموماً کوشاں بھی نہیں نہ ہی اس کا داعی ہے بندہ بندگی کی اعلیٰ مسند پر کب جلوہ افروز ہوگا جب بندہ اپنے مسائل کے حل کے لئے آئی ایم ایف کے بجائے اپنے اللہ کی طرف دیکھے گا اسباب کو اختیار تو کرنا ہی ہوگا کہ یہ دنیا دارالاسباب ہے مگر یقین اور ایمان کی گہرائی والے بندے ایسا نہیں کرتے وہ اسباب کو اختیار تو کرتے ہیں مگر اسباب پر یقین نہیں رکھتے کہ ہوگا تو اللہ ہی کی طرف سے۔ بندہ بندہ ہو کر بھی غیر سے مانگے تو اللہ کو غیرت نہ آتی ہوگی کہ یہ کیسا ہے جو میری واحدانیت کا زبان سے اقرار کرتا ہے دل سے تصدیق کرتا ہے اور سہارا کسی اور کو سمجھتا ہے بندے کا مشہود پھر بھی مطلوب و مقصود اس کا سچا مالک ہی ہوگا تو اس کی عظمت کا ڈنکا بجے گا ورنہ اقوام عالم اسے ڈنگ مارنے کو اکٹھی ہو جائیں گی۔

دل صفائیاں والے صاحب دل صاحب حال شخص سے اک بار ملے تو ایسا لگا کہ ان سے تو پُرانی شناسائی ہے پھر وہ رسم وراہ اور بڑھی تو پوچھا:

''دل کے ساتھ دلائل کا کوئی تعلق؟''

کہا ''دلائل دینا پڑیں تو جان لیجئے گا کہ محبت رخصت ہونے کو ہے۔''

''جیسے دنیاوی محبتوں میں دل پیش کیے

جاتے ہیں اسی طرح محبوب حقیقی کو اپنی محبت انکساری تڑپ ثناسائی عبادت ریاضت ذکر اذکار پیش کریں ہوسکتا ہے بندے کی کوئی ادا اللہ کو پسند آجائے؟" میں نے استفسار کیا تو کہنے لگے:

"ہاں یہ اہم ہے کہ ادائیں کیسے ادا ہوئیں گی"

"ادائیں کیسے ہوں؟ کیوں اہم ہیں؟"

"ان سے مالک خوش ہوتا ہے - اُسے بندے پر پیار آتا ہے وہ محبت کا سب سے بڑا قدردان ہے کسی کی وارفتگی کو ضائع نہیں کرتا-"

بس دل سے پیش کش ہو - دیکھو کسی کو تحفہ پیش کریں تو وہ چیز دیں جو اس کے پاس نہ ہو"

"مگر اللہ کے پاس تو سب کچھ ہے ہر ہر نعمت کے بے پناہ خزانے ہیں کوئی کمی ہے ہی نہیں تو پھر اُسے کیا پیش کریں"

"اس کو عاجزی پیش کریں انکساری پیش کریں چھوٹائی پیش کریں بڑائی تو یوں ہی پیدا ہو جاتی ہے چھوٹائی سیکھنا پڑتی ہے اپنا آپ پیش کریں اپنا سب کچھ پیش کریں دیکھیں حضرت یوسفؑ کو زلیخا نے مائل کیا - قرآن مجید فرقانِ حمید کہتا ہے "حضرت یوسفؑ نے عرض کیا یا اللہ میں اپنے نفس کو اس سلسلے میں بری نہیں کرتا کہ نفس امارہ برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اس نفس کے جس پر میرا اللہ رحم فرمائے" حالانکہ سبھی انبیاء کو نفس مطمئنہ دان کیا جاتا ہے اور انبیاء ڈائرکٹ اللہ جل شانہ کی تربیت میں ہوتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے نفس مطمئنہ کو امارہ کہہ کر اپنی عبودیت محبت عاجزی اور انکساری کا اظہار فرمایا یہ بڑی پیاری ادا تھی اور اس کی ادائیگی بھی بڑی خوبصورت تھی یعنی وہاں محبوب حقیقی سے سچی محبت تھی - الفت بھرا دل تھا اور دل داری تھی دلائل نہیں تھے یوں بھی جو خیال کسی کے دل میں پیدا ہونا ہو اس سے پیشتر ہی محبوب حقیقی اُسے جانتا ہے"

میں نے کہیں لکھا تھا کیفیات اصل ہیں منازل مقامات اور مناقب نہیں - اسی طرح محبتوں میں دل اصل ہے دلائل نہیں - سوچ بھی قیمتی ہے مگر عمل اصل ہے دنیاوی تعلقات میں بھی جہاں دوستی ہو وہاں دلائل نہ دیں مباحثہ نہ کریں مباحثہ اور مناظرہ بے ثمر محنت کے نام ہیں دلائل دے کر ہوسکتا ہے آپ کسی دوست کو قائل تو کر لیں گے مائل نہیں کر سکتے دلائل کی وجہ سے آپ اک اچھا دوست کھو دیں گے کھونا اصل نہیں پانا اصل ہے - اصل پانا یہی ہے کہ سب کچھ کھو کر اپنے مالک کو پالیا تو سب کچھ سے کہیں زیادہ پالیا-

☆☆☆☆☆

غافر شہزاد.....فن و شخصیت کے آئینے میں

ڈاکٹر غافر شہزاد معروف افسانہ نگار، شاعر، محقق، نقاد، سفر نامہ نگار، کالم نگار اور مورخ ہیں۔ ان کی کم و بیش 32 تخلیقی اور تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر انھوں نے بے شمار پروگرام میں شرکت کی ہے۔ وہ علمی و ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے تخلیقی اور تحقیقی کام کا اعتراف معروف ادبی و علمی شخصیات نے کیا ہے۔ وہ دو سال حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ حلقہ کی دو سال کی روداد کی کتابی شکل میں اشاعت کے علاوہ تنقید کے لیے پیش کیے گئے مضامین کا انتخاب بھی شایع کر چکے ہیں۔ غافر شہزاد ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسز اور مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر غافر شہزاد کا اصل نام عبدالغفور ہے۔ وہ ضلع جہلم کے ایک چھوٹے سے گاؤں کنتریلہ میں 20 اکتوبر 1963 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں واقع گورنمنٹ پرائمری سکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ جامع ہائی سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج جہلم سے ایف ایس سی کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے آرکی ٹیکچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ غافر شہزاد کو ان کی کتاب ''لاہور۔ گھر، گلیاں، دروازے'' اور ''لاہور کے مینار'' پر بھی انفارمیشن اینڈ کلچر ڈیپارٹمنٹ، حکومت پنجاب کی جانب سے بیسٹ بک ایوارڈ دیا گیا۔ محکمہ اوقاف میں ملازمت کے دوران پنجاب بھر کے مزارات کی تعمیر نو اور مرمت و توسیع کے منصوبہ جات ان کی ذمہ داری تھی۔ غافر شہزاد کو اپنی ملازمت کے دوران ایک ماہر فن تعمیر ہونے کے سبب بابا بلھے شاہؒ، شاہ حسینؒ، سائیں ترت مرادؒ، میاں شیر محمد شرقپوریؒ اور دیگر درجنوں مزارات کی تعمیر نو اور ڈیزائن کے کام کا موقع ملا۔ 19 اکتوبر 2023 میں تیس سال مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہو گئے اور آج کل لاہور میں ہی مقیم ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے ساتھ قلبی لگاؤ ہونے کے سبب غافر شہزاد نے ان کے 17 نمائندہ افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی، تنقیدی اور سماجی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے ''ندیم کے افسانوی کردار'' نامی کتاب لکھی اور ان کی 18 ویں سال گرہ کے موقع پر ان کو تحفے کے طور پر دی۔ 'مضامین نو' کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ اور 'شیکسپیئر کے دیس میں' سفر نامہ شایع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر غافر شہزاد لاہور کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ایک فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ کالم نگاری کا آغاز 2006 میں روزنامہ اوصاف سے کیا۔ بعد ازاں ''روزنامہ نئی بات'' کے ادارتی صفحہ پر ''شہر آثار'' اور ادبی صفحہ پر ''افق در افق'' کے نام سے اور ''روزنامہ جناح'' میں ''کالم کہانی'' کے نام سے ہر ہفتے کالم لکھتے رہے ہیں۔ ان کے کالموں میں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ تاریخ، مزارات اور شہری معاشرت سے متعلق معاملات پر بات ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ جولائی 2014 میں شروع ہوا تھا جو ایک سال سے زیادہ عرصہ تسلسل کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے بعد آپ روزنامہ دنیا اور انصاف میں بھی ادبی مضامین لکھتے رہے۔ نئے پرانے لاہور کی تاریخ، معاشرت اور مزارات کے کلچر کے حوالے سے غافر شہزاد نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔

☆☆☆☆☆

غافر شہزاد کی افسانہ نگاری

غافر شہزاد نے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ وہ جہلم میں جوگی جہلمی، اقبال کوثر، تنویر سپرا، مختار جاوید، یوسف حسن، شہزاد قمر، احمد لطیف کی محفلوں میں امداد ہمدانی کے ٹی سٹال پر بیٹھتے تھے۔ اسی دوران ان کی توجہ افسانے کی جانب مبذول ہوئی اور زیادہ تر افسانے لکھنے لگے جو فنون اور ماہ نو جیسے ادبی رسائل میں شایع ہوتے رہے۔ ان کی اوّلین کتاب ''تصویریں سانس لیتی ہیں'' افسانوں کا مجموعہ ہی تھی جو 1990 میں شایع ہوئی۔ اب تک ان کے تین دیگر افسانوی مجموعے ''خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی، شہر ناتمام اور کارساز'' شایع ہو چکے ہیں۔ غافر شہزاد کے افسانوں میں اکیسویں صدی کی جدید معاشرت کا انسان اپنی معاشی، سیاسی، اور سماجی پیچیدگیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ کہیں

جناب ناہید شاہد، جناب ڈاکٹر غافر شہزاد۔

علامت کا سہارا لیتے ہیں، کہیں حقیقی کلسم نگاری کی تیکنیک استعمال کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بیان کی گئی کہانی زمین پر بسنے اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے انسانوں کا نوحہ ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا اتنا زیادہ تنوع ہے کہ اردو افسانے میں اس کی خال خال مثال ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب غافر شہزاد، جناب نجیب احمد اور جناب اعجاز کنور راجہ۔

غافر شہزاد کا تخلیقی سفر

1) تصویریں سانس لیتی ہیں۔(افسانے) 1990ء (پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور)
2) چراغ آنکھوں میں (شاعری) 1991ء (پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور)
3) خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی (افسانے) 1995ء (گورا پبلشرز، لاہور)
4) لوک شاہی (ناولٹ) 1998ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
5) مضامین نو (تنقید) 2003ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
6) ندیم کے افسانوی کردار (تنقید) 1997ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
7) چشمِ سیاہ (شاعری) 2001ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
8) شہرِ ناتمام (افسانے) 2001ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
9) لاہور کے مینار (تحقیق) 2001ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
10) لاہور۔ گھر گلیاں دروازے (تحقیق) 2002ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
11) داتا دربار کمپلیکس۔ تعمیر سے تکمیل تک (تحقیق) 2004ء (ادراک پبلی کیشنز، لاہور)
12) شیکسپیئر کے دیس میں (سفرنامہ) 2006ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
13) پنجاب میں خانقاہی کلچر (تحقیق) 2007ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
14) تعمیر و توسیع خانقاہ بابا فریدؒ (تحقیق) 2009ء (سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور)
15) مساجد لاہور تعمیر و جمالیات (تحقیق) 2009ء (سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور)
16) پنجاب میں صوفی درگاہیں۔ کمال سے زوال تک (تحقیق) 2014ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
17) From Sufi Thinking to Sufi Shrine 2014ء (سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور)
18) لاہور کا ادبی منظر نامہ (حصہ اول) 2014ء (الفیصل پبلشرز، لاہور)
19) لاہور۔ نئی صدی، نیا شہر (تحقیق) 2015ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
20) لاہور کا ادبی منظر نامہ (حصہ دوئم) 2014ء (الفیصل پبلشرز، لاہور)
21) منتخب تحریریں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور (حصہ سویم) 2015ء (الفیصل پبلشرز، لاہور)
22) کارساز (افسانے) 2016ء (سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور)
23) انتخابات حلقہ ارباب ذوق (حصہ چہارم) 2017ء (الفیصل پبلشرز، لاہور)
24) گھر کی تعمیر 2018ء (اردو سائنس بورڈ، لاہور)
25) صوفی کون؟ (مضامین) 2020ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
26) مکلی میں مرگ (ناول) 2020ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
27) کرول گھاٹی (ناول) 2021ء (مجلس ترقی ادب، لاہور)
28) استغاثہ (ناول) 2022ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
29) موکش (ناول) 2023ء (فکشن ہاؤس، لاہور)
30) ہوا بارشیلی ہے (شاعری) 2023ء (فکشن ہاؤس، لاہور)

بڑی سڑک [افسانہ]

غافر شہزاد

یہ آوازیں کیسی ہیں؟

آوازیں..... ہاں مجھے بھی سنائی دے رہی ہیں مگر سمت کا تعین نہیں کر سکتا؛ میرا خیال ہے سامنے درختوں کا جُھنڈ ہے اس کے پیچھے سے آ رہی ہیں۔

ہاں..... مگر نہیں..... شاید ان اُونچی عمارتوں کے پیچھے صداؤں کا چشمہ پُھوٹ پڑا ہے۔

تُم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

نہیں..... میرا خیال ہے۔ سڑک کی جانب کوئی ہنگامہ بپا ہے۔

نہیں..... کیا بات ہے سمجھ نہیں آ رہی۔ سمت کا تعین مشکل ہو رہا ہے۔

وہ دیکھو..... ان درختوں کے پیچھے.....

ہاں..... یہ تو روشنی ہے۔ اس اندھیرے میں روشنی کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے..... مگر آنکھوں پہ یقین نہیں ہوتا___

.....شاید نظر کا دھوکہ ہے، اس اندھیرے میں آدھی رات کو دن کا سا اُجالا.....

بات کیا ہے..... ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

دوسرا جو ابھی تک ٹکٹکی باندھے اور کان لگائے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ پہلے نے

پھر کہا......

آؤ چلتے ہیں...... مجھے تو خوف آنے لگا ہے۔

پاگل...... یہ منظر ایک عرصے بعد دیکھا ہے ناں۔ اس لیے عجیب لگ رہا ہے۔ دوسرے نے ڈھارس بندھائی اور روشنی کی جانب چلنے لگا۔ پہلا اس کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ چند قدم آگے چل کر دونوں رُک گئے۔

یار میرا خیال ہے کہ ان کا رُخ ہماری جانب ہے۔

تو پھر ہمیں یہیں ٹھہر کر انتظار کرنا چاہیے۔ پہلے نے کہا۔

نہیں...... ہمیں خود چل کر آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا چاہیے۔

ٹھیک ہے...... اور دونوں تیز تیز قدموں سے راستے کی تمیز کیے بغیر صرف سمت کا تعین کر کے ناک کی سیدھ میں چلنے لگے۔

ارے یہ تو اپنے ہی ساتھی ہیں......

مگر ان کے ہاتھ میں کیا ہے......

ہاں...... میں نے پہچان لیا ہے یہ مشعلیں ہیں۔ میری دیکھی ہوئی ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں ایک ایک مشعل ہے...... یہ تو مشعل بردار جلوس ہے۔

......مگر مشعل بردار جلوس تو فتح کی علامت ہوتا ہے۔

ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ فتح کا ہی تو جلوس ہے۔

کیسی فتح......؟

نئی سحر کی نمود جو ہوئی ہے، دیکھتے نہیں ہو، ہر طرف اُجالا ہی اُجالا ہے۔ پہلے نے اشتیاق سے آنکھیں بغیر جھپکائے مشعلوں پر ٹکائی ہوئی تھیں۔

دوسرا...... کچھ چہرے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا......

تھوڑی دیر کے بعد پکارا...... یہ سب تو اپنے ساتھی ہیں اور وہ یا ہو کا نعرہ لگاتے ہوئے دوسرے سے لپٹ گیا۔

فتح مبارک ہو...... ہم جیت گئے ہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے اپنے دوستوں کو...... مشعلوں کی روشنی میں دیکھو تو چہرے کیسے چمک رہے ہیں...... آنکھیں کتنی زندہ محسوس ہو رہی ہیں۔ ہم جیت گئے ہیں...... آزادی کی صبح مبارک ہو میرے دوست...... اب راج کرے گی خلقِ خدا...... جو میں بھی ہوں___ جو تُم بھی ہو۔ وہ ایک بار پھر اس سے لپٹ گیا۔

علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ خدائے باری تعالیٰ کی ممنونیت کے آنسو...... یوں لگ رہا تھا جیسے دو مشعلیں روشن ہوں۔

وہ دونوں کود کر سڑک پر آ گئے اور تیزی سے چلنے لگے بلکہ بھاگنے لگے۔ پہلا چلتے چلتے رک گیا......

کیا ہوا......؟ دوسرا اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولا۔

میں آگے نہیں جا سکتا......

مگر کیوں.....؟ دوسرے نے پہلے کے لہجے سے کافی کچھ بھانپ لیا تھا اور وہ بھی ڈھیلا پڑ گیا..... مگر کیوں.....؟ آخر کیوں.....؟ اس نے تقریباً اسے جھنجھوڑ دیا۔

مجھے ان مشعلوں میں اپنے..... دو ساتھیوں کا خون جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ارے پاگل ہو گئے ہو..... مشعلیں کبھی خون کے بغیر بھی روشن ہوئی ہیں۔ ان میں تیل کبھی نہیں جلا..... ہمیشہ خون جلتا ہے۔

ہاں تم سچ کہتے ہو..... مگر ان کی لَو بڑھتی لَو میں مَیں ان کا چہرہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ بہت پرجوش ہیں..... بہت خوش ہیں ناں..... آخر ان کی قربانیوں سے ہی تو آزادی کی صبح طلوع ہو رہی ہے..... خوش قسمت ہیں..... کاش مَیں ہوتا ان کی جگہ..... میری تو حسرت ہی بن گئی ہے..... دوسرا دفعتاً جوش سے بولتا جا رہا تھا۔

ہاں تم ٹھیک کہتے ہو..... مگر مجھے ان کی لَو میں ان کی اداس ماں نظر آتی ہے۔ کمر خمیدہ باپ کا عکس جھلکتا ہے..... بہن کے آنسو جلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں..... بھائیوں کے بازو کٹے ہوئے نظر آتے ہیں..... مَیں اس فتح کے جشن میں شامل نہیں ہو سکتا۔

تم ٹھیک کہتے ہو..... مگر یہ بھی تو دیکھو..... کہ ان مشعلوں نے اس اندھیری رات میں بھی دن کا سا سماں کر دیا ہے..... کتنی روشن ہے یہ رات..... اور طلوع ہونے والی صبح اپنے ساتھ زندگی کی تمام تر رعنائیاں لانے والی ہے.....

ہاں..... میرے تمہارے لیے رعنائیاں ہی تو ہیں مگر ان چار چار ٹکوں کی جھونپڑیوں کو دیکھو جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہیں، جن سے ابھرتی ہوئی سسکیاں چار عالم ہر شے کو رلا رہی ہیں.....

مگر ہم کیا کریں؟..... ہمارے اوپر تیرہ شبیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ ہم ان کے خونیں شکنجوں سے بچنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور پھر صبح..... روشن صبح خراج مانگتی ہے لہو کا خراج..... ہمیں دینا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر ہم اندھیرے کی فصلیں نہیں پاٹ سکتے۔ ہمیں زمین کو اپنے لہو سے سرخ انگار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر اس سے اجالوں کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا۔ زمین کی پیاس بجھانے کے لیے لہو کے دریا بہانے پڑتے ہیں۔

پہلا چند لمحے یونہی ساکت و جامد کھڑا مشعل بردار جلوس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر آہستگی سے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا..... تمہیں یاد ہے وہ رات..... ایسی ہی تو ایک رات تھی۔ بس اتنا فرق تھا کہ آج ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں..... روشنی ہے مگر اس رات ان کے ہاتھوں میں سنگ و خشت

تھے۔ زبانوں پر خوشی و فتح کے نعروں کے بجائے احتجاج تھا...... ہر طرف ایک ہی نعرے کی گونج تھی...... اب لے کے رہیں گے حق اپنا...... اور پھر پتہ ہی نہیں چلا...... کیا ہوا...... مجھے خود صحیح طرح یاد نہیں پڑتا کہ مشعل بردار ہجوم کو کس نے بڑی سڑک کی طرف دھکیل دیا تھا۔ سچ ہے جب زمین کی زبان خشک ہو رہی ہو اور لہو چاٹنے کی خواہش پورے عروج پر ہو تو عجیب سا رشتہ ہے زمین کا اور لہو کا...... دونوں ایک دوسرے میں سما جانے کے لیے بے چین و بے قرار ہو جاتے ہیں اور اس رات بھی یونہی ہوا......

ہمیں تو اس وقت پتہ چلا کہ جب گولیوں کی سنسناہٹ کانوں کو چھید رہی تھی۔ ہر گولی کان کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی اور پھر حق و باطل کی اس جنگ میں ہم نے دو جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا......

یوں نہ کہو...... دوسرا بولا، جو کافی دیر سے خاموش پہلے کی گفتگو سن رہا تھا بلکہ یوں کہو کہ چند مفاد پرستوں نے معصوم لوگوں کو پہلے تو چھوٹے چھوٹے مطالبات کا جھانسا دے کر ورغلایا...... بہلایا پھسلایا اور اشتعال دلایا اور جب لوہا گرم ہو گیا تو اس پر اپنی مرضی کا نقش بنا لیا اور کسی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ ہوا کیا ہے اور آج تک تحقیقاتی کمیٹی اتنی سی بات معلوم نہ کر سکی کہ کس طرف سے چلنے والی گولی جسموں کے آر پار ہوئی تھی۔

اور پھر عوام کے جانی و مالی تحفظ کے ضامنوں نے اپنی گولیوں کی تعداد بھی تو پوری جمع کرا دی تھی۔ تمہیں پتہ ہے کہ گولیاں چلانے والوں کی جیبیں کبھی خالی نہیں ہوتیں۔ گولیوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اور بالکل غیر محسوس طریقے سے آپ ہی آپ...... جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو مگر یہ منطق ان مرنے والوں کے ماتم کناؤں کی سمجھ میں تو آتی ہے مگر عدالت کا ذہن اسے ماننے کی اہلیت سے عاری ہے......

مشعل بردار جلوس اب دونوں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور دونوں فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں اس میں شامل ہونا چاہیے کہ نہیں اور پھر جلوس ان کے پاس پہنچ گیا۔ بالکل پاس...... اتنا تو انہیں یاد تھا مگر پھر کیا ہوا پتہ نہیں...... دونوں نے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھا رکھی تھیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ یہ مشعلیں ان کے ہاتھ میں کہاں سے آ گئی تھیں...... بس رقص کرتا ہوا شعلہ اور شعلے کی لَو میں دہکتا ہوا ان کا اپنا وجود...... اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر بڑی سڑک کی طرف جانے والے جلوس میں شامل ہو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

خوابوں کی گِرہ میں پڑی لڑکی [افسانہ]

اسے خواب پسند تھے مگر وہ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والی لڑکی نہیں تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی قطعاً نہیں کہ وہ محض خوابوں کی سلطنت کی شہزادی تھی۔ وہ تکلیف دہ حد تک حقیقت پسند لڑکی تھی بلکہ وہ خوابوں میں بھی حقیقت پسند تھی اور خواب محض عارضی فرار یا ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کے لیے نہیں دیکھتی تھی بلکہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن گئے تھے وہ مجھے خوابوں کے بغیر ادھوری ادھوری لگتی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ آنے کا ہمارا وقت کم وبیش ایک ہی تھا اور آتے ہی میں اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ آج اس نے خواب دیکھا یا نہیں اور اگر خواب دیکھا تو وہ کس طرح کا ہوگا۔ ایک عجیب کشش آمیز چمک ہوتی تھی اس کی آنکھوں میں۔ سردیوں میں تو عموماً ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ٹیرس پر چلے جاتے تھے اور گرمیوں میں ہمارا پڑاؤ وسطی صحن کے شمالی کونے میں پڑے ہوئے دو ٹانگوں والے بینچ پر ہوتا کیونکہ دو ٹانگیں اس کی ٹوٹ چکی تھیں اور ہم نے ہی اپنی ضرورت کے لیے چند اینٹیں جوڑ کر اس بنچ کو سہارا دے کر کھڑا رکھا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کو اتنا سمجھنے لگ گئے کہ میں اسے دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ آج اس نے کس قسم کا خواب دیکھا ہوگا۔ جس روز اس نے پاؤں میں پازیب پہنی ہوتی، اس روز اس کے خواب میں مَیں موجود ہوتا۔ وہ پازیب کو پاؤں کی زیبائش کے لیے نہیں پہنتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے پاؤں اتنے خوبصورت تھے کہ اسے پازیب کی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ ایک طرح سے اس کے نزدیک خود کو دوسرے سے منسوب کرنے کے اعتراف کا اظہار تھا۔ جس روز اس نے کانوں میں لہراتے ہوئے جھمکے پہن رکھے ہوتے اس روز وہ بالوں کو ربن سے باندھ کر آتی تھی اور میں سمجھ جاتا کہ آج اس نے بہت مسرت انگیز خواب دیکھا ہے اور سارا دن وہ خوشگوار طرزیں گنگناتی رہے گی اور بالوں کو بھی اسی لیے ربن سے باندھ کر آتی تھی کہ اس روز بالوں کے الجھنے اور بکھرنے کا زیادہ چانس ہوتا تھا۔ تمام دن وہ ہواؤں کے دوش پر اڑتی رہتی۔ اس روز اسے جو کلاس فیلو برے لگتے تھے ان کے ساتھ بھی وہ بڑی خوشدلی سے بات کرتی۔

عجیب لڑکی تھی۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔ کسی

غافر شہزاد

کا ایک جملہ پسند آ گیا، اپنے دل سے اس کے بارے میں برسوں پرانی تلخی بھی نکال پھینکتی۔ کسی نے غیر متوقع طور پر کوئی ناخوشگوار جملہ کہہ دیا تو پل بھر میں یوں جھلس جاتی جیسے جون کی گرم دوپہر میں کئی کوس پیدل چل کر آئی ہو۔ میں نے کہا ناں کہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے میں تو اس کے لباس کا رنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ آج اس نے کس طرح کا خواب دیکھا ہوگا۔ پھر بھی صبح ڈیپارٹمنٹ آنے پر ہماری پہلی مصروفیت یہی ہوتی کہ میں اس سے خواب کی پوری جزئیات سنتا اور آخر میں وہ بڑا مشکل سوال کرتی کہ میرے خیال میں اس کی تعبیر کیا ہوگی۔ پہلے پہل تو مجھے بڑی مشکل سے گزرنا پڑتا تھا مگر جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ دراصل مجھ سے تعبیر پوچھ نہیں رہی ہوتی بلکہ اپنی تعبیر سنانے کے لیے میدان ہموار کر رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات تو وہ کئی کئی دن تعبیر کی تلاش میں ہلکان ہوتی رہتی اور جب تک کوئی مفروضہ بنا نہ لیتی، اس کا خواب مکمل نہ ہوتا تھا۔

میں نے کہا ناں کہ اس کے لباس کا انتخاب، اس کے خواب کا عکس میری آنکھوں میں لہرا دیتا تھا۔

ایک روز ہم سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ میری نظر سامنے صحن میں اگی ہلکے جامنی رنگ کی کلیوں پر پڑی۔ جوں جوں زینے اوپر چڑھ رہے تھے، کلیاں سامنے آتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس پڑی مگر منہ سے کچھ نہ بولی پھر کئی دن گزر گئے۔ ایک روز میں صبح ہی صبح ڈیپارٹمنٹ آیا تو سیدھا لائبریری میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی اور پھر ہلکے جامنی رنگ کی پھولدار شلوار اور قمیض ــــــ جو زینہ بہ زینہ اترتے ہوئے نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ زینہ اتر چکا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دل میں سوچا۔ زینہ چڑھتے ہوئے ان جامنی رنگ کی کلیوں سے جو لطف آتا تھا، میں صرف اس سے آشنا تھا۔ آج زینہ اترتے ہوئے ان کو دیکھا ہے تو احساس ہوا ہے کہ اس لذت انگیز مسرت سے تو آج تک میں بیگانہ ہی رہا۔ وہ جھینپ گئی اور دوسری سمت دیکھنے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے سن لیا ہو۔

ایک روز صبح ملی تو کہنے لگی میں نے رات خواب میں صحرا دیکھا ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد بولی ”خواب میں صحرا دیکھیں تو کیا ہوتا ہے“ میں خاموش رہا کچھ نہ بولا، بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے شاید پڑھ لیا تھا، کہنے لگی ”کیا سفر درپیش ہوتا ہے؟“ میں پھر بھی چپ رہا۔ بس بینچ کی ٹوٹی ٹانگوں کی طرف دیکھنے لگا جسے اینٹوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے بتایا آج رات اس نے خواب میں صحرا دیکھا تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ تھی دور تک کہیں نخلستان نہیں تھا۔ کہنے لگی میں نے کوشش کی کہ کہیں سراب میں ہی پانی کا چشمہ نظر آ جائے مگر دور دور تک پانی کا نشان تک نہیں تھا۔

میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس روز نہ تو اس نے پازیب پہنی ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے کانوں میں جھمکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں صحرا کی وسعت سمٹ آئی تھی۔ میں بہت دیر تک اور بہت

دور تک خود کو ڈھونڈتا رہا مگر اس حقیقت پسند لڑکی کی آنکھوں میں کہیں میرا عکس نہیں تھا۔

عجیب لڑکی تھی۔ خواب سناتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، جیسے حقیقی احوال بیان کر رہی ہو۔ مگر کچھ ہی دیر بعد ایسے ہو جاتی جیسے آنکھوں کے سمندر میں کبھی مد وجزر آیا ہی نہ ہو۔

ایک روز ملی تو اس نے مکمل طور پر سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ گرمیوں کی صبح ہم لوگ وسطی صحن کے شمالی کونے میں اسی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگی "آج رات میں نے بہت سے کبوتر اڑائے، سفید رنگ کے۔ مگر کوئی کبوتر لوٹ کر نہیں آیا۔ میں ہر اگلا کبوتر اس لیے اڑا دیتی شاید یہ پہلے والے کو ساتھ واپس لے آئے مگر صبح ہو گئی اور میں بیدار ہو گئی، تم سے بھی تو ملنا تھا۔ اگر تم سے نہ ملنا ہوتا تو اب تک میں کبوتر ہی اڑا رہی ہوتی۔" یہ خواب سنا کر وہ بہت دیر تک زمین کی طرف دیکھتی رہی شاید پلکوں پر لرزتے موتیوں نے انہیں بہت بوجھل کر دیا تھا کہ وہ انہیں اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر اچانک اس نے میری سمت دیکھا اور کہنے لگی، پتا ہے اس خواب کی کیا تعبیر ہوگی؟ پھر قدرے توقف سے بولی "تمہیں علم ہے کبوتر انتظار کی علامت ہوتا ہے۔ میرے پاس اور بھی کبوتر تھے میں انہیں اڑاتے ہوئے خواب کو مزید جاری رکھ سکتی تھی۔ آخر کب تک؟ تم سے بھی تو ملنا تھا۔ اس لیے میں خود ہی کبوتر بن گئی اور تمہارے کاندھوں پر آن بیٹھی"۔ اس روز میں بہت چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنا بازو، اپنا کندھا ہلاؤں شاید اسی طرح یہ کبوتر اڑ جائے مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

ایک صبح مجھے ملی اور میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بہت جلدی میں تھی۔ اس روز اس نے پازیب بھی پہنی ہوئی تھی اور جھمکے بھی، پازیب کی چھن چھن کے ساتھ جھمکے یوں لہرا رہے تھے، جیسے جھوم رہے ہوں۔ دسمبر کی دھند آلود دھوپ میں ٹیرس پر پہنچتے ہی کہنے لگی۔ آج میں نے خواب میں دیکھا "میں نے بالکل سفید بے داغ لباس پہنا ہوا ہے اور کہیں سے کیچڑ کا ایک چھینٹا آ کر اسے آلودہ کر دیتا ہے۔" یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے دیپ جیسے یکسر بجھ گئے ہوں۔ بہت افسردہ ہو گئی۔ پھر کہنے لگی "مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ کہیں سے دو ہاتھ آئے، انھوں نے قمیض کے پلو کو دونوں ہاتھوں سے مسلا تو وہ بالکل صاف ہو گئی جیسے پہلے تھی"۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز کھنک دار ہو گئی اور آنکھیں خوشی سے پھیل کر موٹی ہو گئیں جیسے رات بہت گہری نیند سوئی ہو۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ پوچھنے لگی اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟

بہت دیر سوچتی رہی، اور پھر جیسے اسے اس کی تعبیر سمجھ آ گئی ہو۔ اس نے بے خیالی میں پکڑے ہوئے میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور ٹیرس کے دوسرے کونے پر جا کر کھڑی ہو گئی، جہاں دھوپ نہیں تھی، دسمبر کی لمبی راتوں میں کورے میں بھیگی ٹھنڈی زمین تھی۔ میرا سایہ میرے قد سے بہت لمبا ہو گیا تھا اور میں ٹیرس پر لیٹے ہوئے اپنے سائے کو پاؤں سے کرید رہا تھا۔ میری پلکیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں شاید موتیوں کی جھالر نے انہیں بہت بوجھل کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

غافر شہزاد پر اہلِ فن کی مختصر آرا

(تصویریں سانس لیتی ہیں)

.....احمد ندیم قاسمی.....

غافر شہزاد نوجوان تخلیق کار ہے اس لیے اس کی شاعری کے علاوہ اس کے افسانوں میں بھی زندگی پُر جوش اور بھرپور ہے۔ وہ ان افسانوں میں کرداروں کی نفسیات کو چند اشاروں میں یوں بیان کرتا ہے کہ ان کی شخصیتوں کے باریک سے باریک خدوخال بھی نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں سے خارج کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے والا فن کار نہیں ہے بلکہ وہ جنگاہِ حیات میں شامل ہے چنانچہ اس عمر میں بھی وہ زندگی کے نشیب و فراز، ظلمت و روشنی اور کرب و مسرت کے تجربات کو یوں اعتماد کے ساتھ بیان کرتا ہے جیسے ان میں سے خود گزرا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی وہ قدیم و جدید کے ایک متوازن سنگم کی مثال ہے اور زبان و بیان کے معاملے میں بھی اس کے ہاں ایک ایسے اسلوب کی جھلکیاں موجود ہیں جو آگے چل کر اس کی انفرادیت قرار پائے گا۔ مجھے غافر شہزاد کی تخلیق کاری کا مستقبل منور نظر آتا ہے۔

(جون 1990)

.....منصورہ احمد.....

غافر کی اکثر کہانیاں مونولاگ کی صورت میں ہیں۔ اس کی تین چوتھائی کہانیوں میں کردار بے نام ہیں اور رفتہ رفتہ مصنف میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ اس تکنیک میں یکسانیت کا بہت خطرہ رہتا ہے اور عموماً دوسرے درجے کا ادب تخلیق ہوتا ہے، ابھی تک تو غافر نے ان دونوں خطرات سے خود کو بچا رکھا ہے۔ یکسانیت سے اپنے موضوعات کے تنوع کے سبب اور دوسرے خطرے سے تخیل کی تیز رفتاری کے طفیل۔ لیکن آگے چل کر اسے خود میں Shakespearean Detachment پیدا کرنا پڑے گی۔ غافر کا کمالِ فن اس کی ''علامت'' ہے، جسے وہ بہت مہارت اور بلاغت سے استعمال کرتا ہے۔ تجرید کو سراسر بے معنی کہنے والے غافر کی کہانی ''عذاب کا پہلا دن'' پڑھ کر میرے ہم خیال ہو جائیں گے۔ یہ کہانی ہمارے دور کی مکمل تصویر ہے۔ ہمارے ساتھ جو گزری ہے اور ہمارے ردِعمل اس کہانی میں بہت بھرپور انداز سے بیان ہوتے ہیں۔ علامت نگار کہیں بھی ہم سے آگے نہیں نکلتا۔ ہمارے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ مجھے امید ہے غافر اسی طرح زندگی کے بحرِ متلاطم سے ہمارے لیے گہر تلاش کرتا رہے گا۔ (اقتباس)

.....ڈاکٹر ضیاالحسن.....

غافر شہزاد کے افسانوں میں زندگی بہت بھرپور طریقے سے رواں دواں نظر آتی ہے۔ چلتے پھرتے کام کرتے ہوئے لوگ، پررونق بازار، دوکاندار، گاہک، سڑکوں پر بھاگتی گاڑیاں، دفتروں میں سر کھپاتے ہوئے کارندے، لیکن ہر شخص تنہا اور ہر عمل بے معنی ہے۔ زندگی کی یہ بے معنویت اس احساس سے پیدا ہوتی ہے

کہ انسانی ارتقائی سطح کی جبلی زندگی گذار رہا ہے۔ اس کے پاس اعلیٰ زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہر شخص مطمئن ہے لیکن فنکار مطمئن نہیں ہے۔ یہ بے اطمینانی "تصویریں سانس لیتی ہیں" کے ہر لفظ اور ہر فقرے سے عیاں ہے وہ اس بے معنویت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ (اقتباس)

(خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی)

.....مستنصر حسین تارڑ.....

عافر شہزاد کی نسل اتنی خوش قسمت نہیں۔ انہیں تاریخی واقعات نہیں ملے ان کا آفٹر افیکٹ (After effect) ملا ہے ان کے سامنے زوال کی ایک ایسی فلم چل رہی ہے جس کا انجام سب جانتے ہیں۔ پردۂ سکرین پر فلم اپنے منطقی انجام تک پہنچ رہی ہے اور تماشائی چپ بیٹھے دیکھے چلے جا رہے ہیں کیا یہ تمام تماشائی سازش میں شریک ہیں۔ شاید ایسا ہے۔ صرف عافر ایسے لکھنے والے اس سازش میں شریک نہیں اور وہ آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی آواز سنائی نہیں دیتی کیونکہ فلم کا ساؤنڈ ٹریک جان بوجھ کر اتنا بلند رکھا گیا ہے کہ ہال میں سے اٹھنے والی چند آوازیں اس کے شور میں مکمل طور پر دب جاتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہی آواز بلند کرنا ہمت ہے اور جرأت ہے۔ مجھے امید ہے کہ عافر کی آواز بلند ساؤنڈ ٹریک پر حاوی ہو جائے گی کیونکہ اس میں سچائی اور صرف سچائی ہے۔

(خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی)

.....مسعود اشعر.....

عافر شہزاد کے افسانے ایک ایسے نوجوان کا حسیاتی گوشوارہ بناتے ہیں جو ہر شے اور ہر واقعہ کو جذبات کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہے لیکن یہ جذبات فکر سے یکسر عاری بھی نہیں ہیں۔ ہر نوجوان کی طرح ان کے ہاں بھی جذبات اور فکر کی کشمکش ہر سطح پر موجود رہتی ہے۔ کہیں فکر غالب آ جاتی ہے اور کہیں جذبات۔ وہ بلی کی آنکھیں ہوں، گرین ہاؤس اثر یا گھر کی دہلیز تک پہنچ جانے والی جنگ، یہی کشمکش ان کے افسانوں کا تانا بانا بناتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اپنے آپ کو، اپنے ماحول کو اور اپنے عہد کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ کوشش اشاراتی اور ایمائی انداز میں بھی ہے اور سیدھے سادے بیانیہ اسلوب میں بھی۔

(خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی)

.....یوسف حسن.....

عافر شہزاد کے افسانوں کے کردار نہ تو جدیدیت پسندوں کے محبوب، بے چارگی کے مارے ہوئے اینٹی ہیرو ہیں اور نہ عامیانہ فکشن کے سپر ہیرو، کہ یہ دونوں غیر حقیقت پسندانہ نا انسانی صورتیں ہیں۔ ان کے کردار ہمارے سماج کے عام افراد ہیں جو بورژوائزیشن کے بڑھتے ہوئے رشتوں اور مظاہر میں خارجی اور داخلی آشوب سے دوچار ہیں جو مختلف شکلوں کی مغائرت، انفرادیت کی شناخت کھو جانے اور انسانی سطح پر نہ جی سکنے کا ہے جس کو وہ انسان کے بحیثیت ایک نوعی ہستی کے، اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ جینے کی تمنا اور سعی کے ہمراہ پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

غافر شہزاد کی شاعری

غافر شہزاد کا اوّلین شعری مجموعہ ''چراغ آنکھوں میں'' 1991 میں شایع ہوا۔ دس سال کے بعد 2001 میں دوسرا شعری مجموعہ ''چشم سیاہ'' اور تیسرا شعری مجموعہ ''ہوا بارشیلی ہے'' 2023 میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے رائے دینے والوں میں احمد ندیم قاسمی، عطاالحق قاسمی، خالد احمد، امجد اسلام امجد، منصور آفاق، عمران نقوی، اشرف جاوید، اقبال کوثر و دیگر شامل ہیں۔ غافر شہزاد کی شاعری میں مزاحمت کی لہر تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہ کہیں بھی تخلیقی امج اور اظہار کی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھوں نے زبان اور تیکنیک پر تجربہ نہیں کیا مگر ایسی باتیں اشعار میں پیش کی ہیں جو اس سے پہلے اردو شاعری میں کم دکھائی پڑتی ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا کھردرا پن، الفاظ اور غزل کی غنائیت کے ساتھ ایک موثر انداز میں محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے چالیس برسوں میں صرف تین شعری مجموعے اپنے قارئین کو دیئے ہیں، جس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اسی وقت شعر کہتے ہیں جب ان کے پاس کہنے کو کچھ ہوتا ہے۔ ویسے بھی ان کا ایک نظام فکر ہے، معاشرے اور سماج کے بارے میں ایک سوچ ہے، انسانی زندگی کے مسائل کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں جو ان کے ہاں افسانوں، شاعری اور ناول کے علاوہ کالموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

چراغ آنکھوں میں

.....احمد ندیم قاسمی.....

غافر شہزاد اردو شعراء کی جدید نسل کا جدید تر، بلکہ جدید ترین نمائندہ ہے مگر وہ ان شعرا میں شامل نہیں ہے جو سَر تا پا جدید نظر آنے کے لیے ماضی کی تمام اقدار کی تنسیخ کو اپنی انفرادیت کا اوج سمجھتے ہیں اور یوں ماضی و حال سے کٹ کر مستقبل کو چند لایعنی استفہامئے دینے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے۔ غافر شہزاد شاعری کی جملہ مثبت اقدار سے بھی مسلح ہے اور مسلسل صورت پذیر ہوتی ہوئی نئی اقدار کا بھی عکاس ہے، اسی لیے اس کی غزلوں اور نظموں میں عہدِ حاضر سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ غافر شہزاد کے اس اولین مجموعہ کلام میں طلوع کا اجالا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سامنے امکانات کے آفاق پھیلے ہوئے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ ان امکانات کو تشنہ نہیں رہنے دے گا۔ (اقتباس) (اپریل 1991ء)

چراغ آنکھوں میں

.....عطاالحق قاسمی.....

''میرے پاس اس سوال کا واضح جواب نہیں ہے کہ جب غافر شہزاد کی عمر کے نوجوان گہری سوچوں میں مبتلا ہو جائیں تو یہ امر قوم کے لیے خوش آئند ہوتا ہے یا اسے لمحہ فکریہ سمجھنا چاہیے۔ بہرحال غافر شہزاد کی شاعری میں اس بے فکرے پن کی پرچھائی بھی نظر نہیں آتی جو رات کو دیر تک جاگنے اور صبح دیر تک سونے کا جواز رکھنے والی اس عمر کے نوجوانوں کے انگ انگ سے پھوٹتی نظر آتی ہے بلکہ اس کے برعکس یہ نوجوان شہر کی بند گلیوں اور بند دریچوں پر دن اور رات کے لمحوں میں دستک دیتا نظر آتا ہے جنہیں صرف اس پر نہیں سب پر کھلنا چاہیے تھا لیکن یہ بند گلیاں اور دریچے جس اسم اعظم سے کھلے ہوتے ہیں اس اسم اعظم کو ذہنوں سے محو کر دیا گیا ہے۔ غافر شہزاد اپنے ذہن کے دریچوں پر بھی دستک دیتا ہے اور اپنے قارئین کی یادداشت بھی آزمانے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے افسردگی اور اداسی کے سندیسوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ غافر شہزاد کی عمر کے نوجوان ان بکھیڑوں میں نہیں پڑا کرتے۔ وہ بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن خوبصورت شاعری سے بھی تو وہی محروم رہتے ہیں۔
(اقتباس) (اپریل 1991ء)

.....

چراغ آنکھوں میں

.....خالد احمد.....

''فنون کے بہرۂ اختلافات میں غافر شہزاد کے نام نے ذہن پر ایک کھردری سی لکیر کو جنم دیا اور پھر فنون، ادب لطیف، ماہ نو، اردو ادب، دستاویز اور خیمت کے صفحات پر ابھرتے چلے جانے والی یہ کھردری سی لکیر بڑے گرے نقوش چھوڑتی ہوئی آہستہ آہستہ دل کی طرف بڑھتی چلی گئی، غیر محسوس انداز میں''۔(اقتباس)

چشم سیاہ

.....اقبال کوثر.....

''موضوعاتی پیکروں کو شاعر نے نہ صرف فنی و شعری سطح سے دیکھا ہے بلکہ ان کے مختلف خطوط و نقوش اجاگر کرنے میں اس کا یہی اضافی ابعادی ویژن بھی اس کا لازمی حصہ بنتا ہے۔ جس کے زیر اثر مجموعاً اس کی شاعری میں ایک خاص تنظیم و تناسب کا حسن بھی رچا بسا محسوس ہوتا ہے جس سے شعری کرافٹ کا سبھاؤ اور الفاظ کے دروبست کا رکھ رکھاؤ خاصا دلنشین ہو گیا ہے''۔(اقتباس)

☆☆☆☆☆

غزل

کسی بھی بات پہ کب اختیار ہے اپنا
یہ دِل تو اُس کا ہے، دِل کا فشار ہے اپنا

کئی برس کی مسافت کے بعد رُک کر جب
اُسے گنا تو لگا بے شمار ہے اپنا

پلے ہیں پیڑوں میں اور ٹہنیوں پہ کھیلے ہیں
اِسی لیے تو بدن سایہ دار ہے اپنا

خلاف لہروں کے، میں خود کو آزماتا ہوں
وگرنہ کب کوئی دریا کے پار ہے اپنا

خوشی سے جیتے رہے ہم تمہاری خوشیوں میں
اور اب تمہارا ہی غم، غمگسار ہے اپنا

کبھی گماں کہ کماؤں گا اور کھاؤں گا!!
کبھی یقین کہ پروردگار ہے اپنا

وہ رزق دیتے ہیں ہم کو، مگر قطاروں میں
سو چیونٹیوں میں ہی غافر شمار ہے اپنا

غافر شہزاد

غزل

جو دل کی بات تھی، وہ بات میں اتر آئی
اک ایسی کاری گری ہاتھ میں اتر آئی

میں گر کے پانی میں، تحلیل دائروں میں ہوا
کشادگی سی مری ذات میں اتر آئی

میں جوں ہی چلنے لگا الٹے پاؤں سے سیدھا
بلا اک اور مری گھات میں اتر آئی

فلک پہ اڑتے بہم اس نے فاصلہ رکھا
منڈیر پر وہ مرے ساتھ میں اتر آئی

دعا کے واسطے میں ماں سے کہنے والا تھا
سو کامیابی مری مات میں اتر آئی

دکھائی دیتا تھا کعبے سے گنبدِ خضریٰ
جو حمد تھی وہ مری نعت میں اتر آئی

بجھا چراغ تو غافر مجھے لگا جیسے
اک اور رات مری رات میں اتر آئی

غافر شہزاد

غزل

اُس سے جو کہنا تھیں باتیں، ان کہی کرتا رہا
عمر بھر میں زندگی کو ملتوی کرتا رہا

کھول کر دیکھا نہیں اس نے مرے دیوان کو
ہائے میں کیوں اس کی خاطر شاعری کرتا رہا

جلنے والا اک دیا جلتا رہا ہے رات دن
مر گئے کی قبر پر وہ روشنی کرتا رہا

کھیل تھا اور کھیل بھی ایسا عجب تھا، کیا کہیں!
ہم گرفتاری دیئے اور وہ بری کرتا رہا

گھر بنانے کے جنوں میں مبتلا ایسا ہوا
اپنے چاروں اور دیواریں کھڑی کرتا رہا

آئنے کے جیسے، اُس کے سامنے تھے ہم کھڑے
رخ بدل کر ہم سے وہ جو بے رخی کرتا رہا

خواب تک بھی اختیاراتی نہیں تھے اپنے جب
بس میں اپنے کچھ نہیں تھا، بے بسی کرتا رہا

قبر جیسے گھر میں غافر جو تھا دفنایا ہوا
شہر والوں کی نظر میں زندگی کرتا رہا

غافر شہزاد

غزل

رُکے رہے تو کہیں یوں نہ ہو کہ مر جائیں
کھلا ہوا ہے اشارہ، چلو گزر جائیں

رواں ہیں سڑکوں پہ جو لوگ، کیا وہ زندہ ہیں
اگر ہیں زندہ، کہو اِن سے اپنے گھر جائیں

یہ شہر، شہرِ سگاں ہے، سو اب یہ لازم ہے
اگر زباں نہیں کٹتی تو اِن کے سر جائیں

ہے انتظار انہیں، موت چل کے پاس آئے
یہ حوصلہ ہی نہیں لوگ خود ہی مر جائیں

جو سامعین ہیں اُن سے مری گزارش ہے
بڑھائیں اپنے قدم، شور میں اُتر جائیں

ہمارا عہد تو اِک عہدِ ناسپاساں ہے
چڑھاوا قبروں کا ہے، ہم جدھر جدھر جائیں

یہ کھیل دھوپ کا تھا، چھاؤں تو ملی ہی نہیں
ہے ساتھ سایا، اِسے لے کے ہم کدھر جائیں

ہوا کے دوش پہ، ہوں گے کسی دھماکے میں
سب ایک ساتھ رہیں ہم کہ پھر بکھر جائیں

غافر شہزاد

غزل

کب مری عمرِ رواں گھر میں پڑی چلتی ہے
پاؤں جب ساتھ نہ دیں دوست! چھڑی چلتی ہے

گھر کے کونے میں پڑے رہتے ہیں چپ چاپ سے ہم
ورنہ اس شہر میں اپنی تو بڑی چلتی ہے

کوئی خوشبو سا سفر ہے جو نہیں رُک پاتا
راہ رُکتی ہے تو پھولوں کی لڑی چلتی ہے

جیسے بستر پہ نہیں، میں کسی دیوار پہ ہوں
دل کی دھڑکن نہیں چلتی ہے، گھڑی چلتی ہے

گردشیں یوں ہیں مسلط مرے گھر آنگن پر
بیٹھوں دیوار پہ، دیوار کھڑی چلتی ہے

میری آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جو اشکوں کے نگیں
تو سمجھتا ہے کہ ساون کی جھڑی چلتی ہے

مجھ ستوں پر تو نہیں سارا توازن غافر
میں چلوں، یا نہ چلوں، چھت کی کڑی چلتی ہے

غافر شہزاد

غزل

گزر رہے ہیں جو دن، راگانی کے دن ہیں
یہ پیلی سرسوں کھلی، اُس کہانی کے دن ہیں

نظر تو آتے نہیں ہیں، سنائی دیتے ہیں
لکھے ہوئے ہیں کہاں، یہ زبانی کے دن ہیں

گزرتے وقت میں ٹھہراؤ ایک لمحے کا
مکاں میں رہتے ہوئے، لامکانی کے دن ہیں

روانیوں میں رہے ہیں، نہ پانیوں میں رہے
پڑے ہیں دھوپ میں ہم، سائبانی کے دن ہیں

ہوا گزرتے ہوئے کہتی ہے دریچوں سے
پگھلتی برف کے ہیں کب؟ روانی کے دن ہیں

پھلوں لدی ہوئی شاخیں، بڑھا کے میری طرف
شجر نے مجھ سے کہا، میزبانی کے دن ہیں!

سوال پوچھتے ہیں سوکھے خشک ہونٹوں سے
کہاں گئے ہیں جو کہتے تھے، پانی کے دن ہیں

ستارے بجھتے ہیں، سورج نکلتا ہے خوں میں
ہماری راتیں ہیں بوڑھی، جوانی کے دن ہیں

حدود ختم ہوئی صبح و شام کی غافر
شبیں ہیں گریہ کناں، نوحہ خوانی کے دن ہیں

غافر شہزاد

غافر شہزاد کی ناول نگاری

ناول کے انتساب نے پہلی نظر میں ہی مجھے چونکا دیا ہے اور میں شعوری سطح پر جارج آر ایل کے ناول 1984 کے بگ برادر کے بارے سوچنے لگی ہوں جو ''کہیں نہیں ہے اور ہر کہیں ہے''۔ ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی فضا میں جس طرح ہمارے مذہبی رہنما قہار اور جبار کے غیر مرئی تصور کو ہمارے پراگندہ ذہنوں پر مسلط کر کے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرتے ہیں اور پھر از راہِ تفنن، کبھی کبھار یہی ڈنڈا بردار ہستی لم یزل مظلوم انسانوں کے ریوڑ پر اپنی عنایات کی بارشیں کرتی اور انھیں من و سلویٰ سے نوازتی دکھائی دیتی ہے تو ذہن میں پہلے سے جاگزیں خیر اور برکت کی سب داستانوں پر مطلق سچائی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ناول کا ایک اہم کردار ''بڑا صاحب'' بھی غیب کی خبر رکھتا ہے۔ وہ بھی علیم اور بصیر ہے اور اس کی نادیدہ گرفت سے سب پناہ مانگتے ہیں۔ اپنی میز پر رکھی گھنٹی کو وہ ''کن'' کا نام دیتا ہے۔ بڑے صاحب کی موجودگی ہی وہ مرکزہ ہے جس کے گرد قانون اور مخلوق ایک دائرے میں سفر کرتی رہتی ہے۔ غافر نے اپنے ناول کا انتساب اِسی بڑے صاحب کے نام کیا ہے۔ (اقتباس)

.....اسد ریاض.....

ناول کا پلاٹ انتہائی مربوط اور جامع ہے۔ واقعات کا تسلسل ایسا فطری ہے کہ کہیں کوئی بات اضافی نظر نہیں آتی۔ اسلوب سادہ اور عام فہم مگر معیاری اور ادبی ہے۔ ناول میں مصنف نے جن واقعات کو بڑی مہارت اور دلیری کے ساتھ پیش کیا ان واقعات پر پہلی بات تو یہ ہے کہ ادیبوں کی نظر ہی نہیں پڑتی اور اگر پڑتی بھی ہوگی تو اتنے شفاف اور حقیقی انداز میں کسی کی بیان کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ مصنف نے افسر شاہی، صحافت، ٹھیکے داروں اور ملازمین کو سسٹم برباد کرنے اور حکومتی خزانے پر نقب لگاتے ہوئے جس طرح ناول میں دکھایا ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ (اقتباس)

موکش (ناول)

.....غلام حسین ساجد.....

''موکش'' دوہرے بیانیے کا ناول ہے۔ ناول کا ایک راوی عارف محمود ہے جو ادب و شعر سے پوری طرح جُڑا ہوا تو نہیں مگر باقی تینوں مردانہ کرداروں احسن جمال، اظہر نفیس اور راحت وسیم، کہ جن کی زندگی تخلیقِ فن سے مکمل طور پر جُڑی ہوئی ہے، کی جیون کتھا اور دائرہ عمل کے بارے میں مکمل

آگاہی رکھتا ہے جب کہ چوتھے کردار یعنی ماں جی سے تو اس کا رشتہ بہت ہی نزدیکی یعنی ان کی اولاد ہونے کا ہے۔ اس طرح وہ ان چاروں کرداروں کی زندگی، ان کے پس منظر اور نفسیات کو سمجھنے اور اس کی شرح کرنے میں حق بجانب ہے، جب کہ ناول کا دوسرا راوی موت ہے جو زمانی اور فکری حوالے سے اپنے طرز عمل اور انسان کے اس سے بچ نکلنے کی کوشش کا تفصیلی ذکر کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسان نے اس پر قابو پانے اور کس کس طرح اسے ٹالنے اور شکست دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہے۔ اس ضمن میں ناول نگار نے ماورائے تاریخ زمانے سے مذہب کے آغاز، دنیا کے قدیم ترین مذاہب یعنی ہندوازم، بدھ مت اور جین مت وغیرہ سے شروع کر کے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے نظریہ حیات و موت پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس ساری پیش رفت میں موت کو پرسونیفائی کر کے اس کی زبانی سے اس سلیقے سے بیان کیا ہے کہ یہ ناول ایک نادر علمی بحث ہر مشتمل ایک ایسی دستاویز بن گیا ہے جو اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ (اقتباس)

.....ڈاکٹر شاہدہ ولادر شاہ.....

ناول کا ایک کردار کہتا ہے کہ انسان اپنی موت کے لیے وقت اور جگہ کا انتخاب خود ہی کرتا ہے۔ جیسے جدید دریافتوں نے انسان کی پیدائش پر کنٹرول پانے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے، ایسے ہی موت کے حوالے سے بھی اسے اختیار حاصل ہوتا جا رہا ہے کہ اس نے کہاں اور کب مرنا ہے؟ اپنے اس تھیسز کو ثابت کرنے کے لیے ناول نگار نے جدید تحقیق کی طرح شواہدات کا سہارا لیا ہے۔ ناول کے اندر کسی سوال کو سامنے رکھتے ہوئے، ایسے شواہدات تلاش کرنا اور پھر انھیں تھیسز کا حصہ بنانا، دراصل جدید سائنسی تحقیق کا ایک انداز ہے۔ ناول نگار چوں کہ خود ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیے بیٹھا ہے، اس لیے وہ جدید تحقیق کے طریقہ کار سے آگاہ ہے۔ اس نے اس ناول میں تحقیق کے اسی طریقہ کار کو اپنا اسلوب بنایا ہے اور حقیقی اموات کے ساتھ ساتھ موت کے تاریخی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ مذاہب عالم سے پہلے موت کے بارے میں کیا تصورات تھے اور جب مختلف مذاہب انسانوں نے اختیار کیے تو موت کے حوالے سے کیا مفروضے قائم کیے جاتے رہے، ناول نگار نے اس تاریخی تناظر کو اس ناول میں منفرد اسلوب کے طور پر شامل کیا ہے۔ (اقتباس)

.....عبدالوحید.....

ناول نگار نے خاص طور پر اس ترتیب کا خیال رکھا ہے کہ ایک یا دو ابواب چھوڑ کر ہر اگلے باب میں موت کے خیالات کو بیان کیا جائے یا ان تصورات کو کھنگالا جائے جو دنیا

کے مختلف خطوں میں موت کے حوالے سے پریکٹس کیے جاتے ہیں۔ موت کے بارے مصریوں، سمیریوں، ہندوستانیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے کیا کیا تصورات پیش کیے اس ناول میں ان سب کا تفصیل سے ذکر ہے۔ موت کے بارے تصورات اس ناول میں ایسے ہی بیان ہوئے ہیں جیسے کسی کردار کے بارے اردگرد کے لوگ کیا سوچتے ہیں۔ اس ناول میں عہد گزشتہ کو یاد کرتے ہوئے موت جہاں مطمئن نظر آتی ہے، وہیں میڈیکل سائنس کی ترقی دیکھ کر فکر مند بھی ہے کہ کہیں موت کی موت ہونے کا وقت تو نہیں ہوا چاہتا۔ موت کے بارے ناول کا عنوان 'موکش' اپنے آپ میں انتہائی توانا بھی ہے اور دھرتی سے جڑا ہوا بھی ہے۔ (اقتباس) عافر شہزاد کی ناول نگاری

1-لوک شاہی (1998): اس ناولٹ میں ان نادیدہ قوتوں کا تذکرہ ہے جو میڈیا پر کنٹرول کرنے کے لیے صحافیوں کو ذہنی طور پر اپاہج بناتی ہیں اور دوسری جانب وہ تدریسی ضابطوں کے دانشور ہیں جو طلبہ کی کھیپ اپنے مقاصد کے لیے تیار کرتے ہیں اور پھر انھیں عملی زندگی میں بھیج کر ان کی ڈوریں چھوڑ دیتے ہیں، ایک انوکھے انجام کا ناول جہاں ایک صحافی کی حفاظت کے نام پر اس پر مسلح پہرے کا نفاذ کیا جاتا ہے جو اس کی صحافتی زندگی کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔

2-مکلی میں مرگ (2000): ناول میں ایک ایسے مزار کے بدلتے ہوئے تشخص کو موضوع بنایا گیا کہ جس کے عقیدت مند وقت کے بدلتے ہوئے رجحان کے پیش نظر اس کی مذہبی پہچان بدل دیتے ہیں، دوسری جانب ایسی این جی او کا تذکرہ ہے جو تعمیراتی اور مذہبی کلچر کے نام پر پیسے کمانے کے دھندے میں ملوث ہے جب کہ ناول میں ایسے افراد کی کرپشن کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کے لیے مزار مادی و مالی منفعت کی مشین ہے، ایسے کیسز جب عدالت کے پاس پہنچتے ہیں تو عدالتیں کس طرح اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق مزار کا تعمیراتی تشخص قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

3-کرول گھاٹی (2021): کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب ان پر کوئی وقوعہ ہوتا ہے تو وہ اپنی نئی پہچان بناتی ہیں، کرول گھاٹی ناول میں کرول گھاٹی ایسی ہی ایک جگہ رنگ روڈ پر ہے جہاں رات کے کسی سمے میں ایک عورت کا اس کے بچوں کے سامنے ریپ ہوتا ہے اور پھر اس واقعے کی سچائی کو سوشل اور الیکٹرون میڈیا اپنے خاص انداز سے پیش کر کے ناظرین کے سامنے اپنا سچ قائم کرتے ہیں اور اس جگہ کی نئی پہچان بناتے ہیں، ''منٹو کے مطابق'' پروگرام میں سعادت حسن منٹو کس طرح عورت کی بے بسی اور ظلم پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ذمہ دار اداروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، سیف سٹی

اتھارٹی جب شہر کے مرکزی حصے میں کیمرے لگا دیتی ہے تب جرم شہر کے نواح میں منتقل ہو جاتا ہے، عدالتیں اور تفتیشی کس طرح حقائق کو پیش کر کے حتمی فیصلے تک پہنچتے ہیں، اس ناول کا موضوع اس کا احاطہ کرتا ہے۔

4-استغاثہ (2022):اس ناول میں ایک سرکاری ملازم جج کے سامنے اپنی تیس سالہ سروس کا استغاثہ پیش کرتا ہے جس کا فوکس اس بات پر ہے کہ غلامی ختم نہیں ہوئی، بردہ فروشی اب بھی ہوتی ہے، بس اس کی شکلیں اور منڈیاں بدل گئی ہیں، غلامی کے لیے تحمل، صبر، تابع فرمانی، درگزر، برداشت اور تذلیل برداشت کرنا لازمی علامات ہیں، دفتری زندگی میں کامیابی کی یہی کنجی ہے، ناول میں آرکیٹیکٹ بمقابلہ ٹیکنوکریٹس، بیوروکریٹ اور سیاستدان ایک موازنہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے، ناول کے آخر میں آرکیٹیکٹ اعتراف کرتا ہے کہ اس کا کام تو تخلیق کرنا تھا اور یہ صفت خداوندی ہے جو اسے ودیعت کی گئی ہے، وہ بے وجہ گریڈوں اور عہدوں کے پیچھے بھاگتا رہا، اسے تو صرف ایک ڈرافٹنگ ٹیبل جتنی جگہ درکار تھی جہاں وہ عمارتیں ڈیزائن کرتا ہے اور جہاں اس کی تدفین ہو سکتی ہے۔

5-موکش (2023):اس ناول میں صدیوں سے چلے آنے والے مہابیانیے کو منہدم کیا گیا ہے کہ انسان کی موت کے لیے ''وقت اور جگہ'' کا تعین پہلے سے کر دیا گیا ہے، ناول کا موضوع اور کرداروں کی تفصیلات یہ ثابت کرتی ہیں کہ جیسے انسان اپنی زندگی کے بارے میں پلان کرتا ہے ویسے ہی کسی نہ کسی شعور و لاشعور کی سطح پر وہ اپنی موت کے لیے ''وقت اور جگہ'' کا تعین بھی کیے لیتا ہے اس کے علاوہ اس ناول میں ''موت'' کو کردار بنا کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ کبھی روح اور کبھی عزرائیل سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنے مقام کی طلب گار نظر آتی ہے، موت کا خیال ہے کہ انسان نے چالاکی کی، آب حیات نہیں پیا مگر موت کو شکست دینے کے لیے اس کی سائنسی بنیادوں پر کوششیں آج بھی جاری ہیں، وہ اپنی حیات کے عرصہ کو طوالت دینے میں کامیاب ہوتا جا رہا ہے اور یہ کامیابی موت کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔

غافر شہزاد کے چاروں ناولوں کے حوالے سے مختلف ادیبوں و شاعروں کی رائے دیکھتے ہیں:

لوک شاہی (ناولٹ)

.....ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا.....

غافر شہزاد گنے چنے نوجوان لکھنے والوں میں شامل ہے جو اپنی ہمہ پہلو تخلیقی صلاحیتوں سے سب کو متوجہ کر رہا ہے۔ شروع ہی سے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب اس

کی تگ و تاز کا میدان رہا ہے___ اور غالباً اب وہ وقت آ گیا ہے جب اس کی فکشن ان مراحل میں داخل ہو رہی ہے جو کسی لکھنے والے کی پہچان بن جاتی ہے۔ لوک شاہی ناولٹ کا بنیادی کردار بیک وقت منفرد بھی ہے اور علامتی بھی، اگر محض علامتی ہوتا تو مصنف اس تفصیل کے ساتھ ہمیں اس کے ذہنی پس منظر سے آشنا کرانے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ غافر شہزاد ایک اعلیٰ درجے کا باصلاحیت تخلیقی فنکار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ نظریات کو موثر طریقے سے پیش کرنے کا ڈھنگ کیا ہے۔ پلاٹ پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ کردار اس کی ہنرمندی کے گواہ ہیں۔ میں غافر شہزاد کو اس عمدہ ناولٹ کی تخلیق پر مبارکباد دیتا ہوں۔ (اقتباس)

مکلی میں مرگ (ناول)

.....امجد اسلام امجد.....

ناول میں جگہ جگہ نئے اور پرانے مزاروں کے حوالے، جدید اور قدیم فن تعمیر اور مجاز اور حقیقت کے مباحث اور باہمی تعلق پر بات کی گئی ہے اور بیشتر مقامات پر قاری غافر کے پیش کردہ بیانیے میں گم اور محصور رہتا ہے کہ وہ خود نہ صرف ایک باکمال آرکیٹیکٹ ہے بل کہ اس کا اختصاص بھی پرانی اور تاریخی عمارات کی حفاظت اور تعمیر و تزئینِ نو ہے اور اس موضوع پر فی الوقت اس کا شمار ماہرین میں ہوتا ہے مگر میرے نزدیک اس بات کا دوسرا حصہ یعنی ان مزارات کی تاریخ، نوعیت، ان سے متعلق متولیوں کی مفاد پرستی اور عوام الناس کی ان قبروں میں آسودہ بزرگوں کی نسل در نسل زندہ لوگوں سے زیادہ تعظیم کرنا ہے۔ اگرچہ ناول میں زیادہ تر مسائل کا ذکر اس کے مرکزی موضوع یعنی بی بی پاک کے مزار، اس کی تاریخ، ملحقہ قبرستان اور مختلف ادوار میں اس کی آڑ میں کی گئی مفاد پرستی ہے مگر روحانیت اور دنیا داری اور مجاز اور حقیقت کے حوالے سے کی گئی باتیں بہت اہم اور قابل فکر ہیں۔ (اقتباس)۔

.....شاہین مفتی.....

مصنف نے اپنے ناول میں مکلی کے وسیع تر استعارے کو موت سے ہم کنار ہونے والی بہت سی معروف اور غیر معروف شبیہوں سے جوڑ دیا ہے اور سوال اٹھایا ہے کہ انسان کی اصلی زندگی کون سی ہے: وہ جو اس نے گذاری؛ وہ جو قبر میں ہے؛ وہ جو اگلی دنیا کے وعدے سے بندھی ہے یا وہ جو بیان کرنے والے لوگوں کے اذہان میں ابھاری جاتی اور پھر قبر کہیں پیچھے رہ جاتی ہے اور فرد کا ہیولیٰ وضاحت اور تشریح شدہ شخصیت کے ساتھ نسل در نسل لوگوں کے دلوں اور اذہان میں ایک مخصوص موجودگی میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ مصنف نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تعمیرات کے ڈیزائن اور مزارات کی

اشکال اپنے مکینوں کے شخصی اوصاف سے بندھی ہوئی ہیں۔ مصنف کا خیال ہے انسانی مغالطے وقت گزرنے کے ساتھ ایک خود ساختہ سچائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر یہی خود ساختہ سچائی دائمی زندگی پا لیتی ہے۔ کہانی میں تہ در تہ کئی پلاٹ ہیں جنہیں مختلف کرداروں کے توسط سے آگے بڑھایا گیا ہے۔ (اقتباس)

.....محمد سلیم الرحمٰن.....

ناول تمام تر تعمیری مسائل کے بارے میں ہے اور دو معاملات ''وارث شاہ میموریل کمپلیکس'' اور ''بی بی پاک'' بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ناول کو پڑھ کر بہت سے قارئین کو ایسی باتوں سے آشنائی حاصل ہو سکتی ہے جن پر انھوں نے شاید کبھی کوئی خاص توجہ نہ دی ہو۔ غافر شہزاد کی نظر معاشرے کے بگاڑ پر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بعض باتوں یا روایتوں کو بار بار دہرایا جائے تو ان میں سچائی کا ٹھوس پن پیدا ہو جاتا ہے، چاہے اصل میں وہ بے بنیاد ہوں۔ ان کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے علم کا قبرستان بن چکے ہیں۔ (اقتباس)

.....گلنار کوثر.....

یہ بہرحال ایک روایتی ناول نہیں ہے! موضوع کے اعتبار سے ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے قدرے منفرد کام ہے۔ مصنف کو اپنے پروفیشن، جاب اور ریسرچ ورک سے اس ناول کے لیے خاصی مدد ملی۔ ایک اہم بات مصنف کی دیانتداری ہے کہ وہ تصوف کے اس گہرے جذبے سے لے کر مزاروں کے ضمن میں ہونے والی کرپشن تک نہایت غیر جانبدار ہے اور ایسا کائیاں کہ آپ اس کے نکتہ نظر کو جان ہی نہیں سکتے البتہ سلطان باہوؒ کا کلام کوٹ کرتے کہیں ہلکی سی جذبے کی لہر اس کی سطروں میں ضرور در آتی ہے۔ ناول ہمیں مزاروں کی تاریخ کے ذریعے پنجاب کی تاریخ کی جھلکیاں بھی دکھاتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مناظر انلارج کر کے دکھاتا ہے جن سے ہم کئی بار بے خیالی میں گزرتے رہے۔ قبرستانوں کے متعلق حقیقت اور فینٹسی کا تال میل زندگی اور موت کے فلسفے کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ (اقتباس)

.....رحمٰن حفیظ.....

اس ناول میں غافر شہزاد کے لئے سب سے بڑا چیلنج اس پلاٹ کی منفرد اور مختلف فضا تھی جس کے سیکڑوں پہلو تھے۔ ان پہلوؤں میں سے بیشتر کا ایک نئی قاری کے چشم و ذہن کی رسائی میں ہونا مشکوک تھا۔ تعمیرات کے حوالے سے صرف یہی نہیں بلکہ ایک اور اہم معاملہ بھی درپیش تھا اور وہ تھا ہمارے مزاراتی انداز تعمیر کا تجزیہ اور کسی حد تک اس کا بین الاقوامی جدید انداز تعمیر سے موازنہ۔ اس کی وجہ اس ناول کا مرکزی کردار ارسلان ہے جو امریکہ کا پڑھا لکھا فرد ہے لیکن اس

کے آباو اجداد کا تعلق بستی خواجہ غلام فریدؒ کوٹ مٹھن، پاکستان سے ہے۔ وہی اس ناول کے ایک اہم ٹرننگ پوائنٹ کا باعث بھی بنتا ہے۔ غافر شہزاد کے بقول اس کردار کی کایا کلپ ہوتی ہے مگر ان معنیٰ میں نہیں جس طرح کافکا کے افسانے ''میٹا مارفوسز'' یا انتظار حسین کے افسانے ''آخری آدمی'' میں دکھائی گئی ہے۔ یہ کایا کلپ نظریاتی اور تخلیقی سطح پر وقوع پذیر ہوتی ہے اور ارسلان کے مجازی بطن سے ایک نیا ارسلان پیدا ہوتا ہے۔ (اقتباس)

کرول گھاٹی (ناول)

.....غلام حسین ساجد.....

کرول گھاٹی'' کا پلاٹ بہت چُست اور موثر دے پر ''زنا بالجبر'' کے ایک معروف واقعے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے پردے میں غافر شہزاد نے الیکٹرانک میڈیا کے کھوکھلے پن اور اصل واقعے کی ماہیت کو بدل دینے کی روش پر بات کی ہے۔ یہی نہیں، یہ بھی بتایا ہے کہ بعض اوقات اصل حقیقت کسی اور حقیقت کے پردے میں چھپی ہوتی ہے اور اس کے ظاہر نہ ہونے میں ہی بھلائی ہوتی ہے جس کی واضح مثال اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جو مجرم ہو کر بھی بے گناہ ہے اور بے گناہ ہو کر بھی اپنے مجرم ہونے کا اقرار کرنے میں عافیت جانتا ہے۔ غافر شہزاد نے ناول میں منٹو کے کردار کو بطور تجزیہ نگار پیش کر کے ایک نئی تخلیقی جہت کا ڈول ڈالا ہے۔ اس حوالے سے غافر نے جو گفتگو درج کی ہے، وہ منٹو کو سمجھنے میں بھی معاون ہو سکتی ہے اور ہماری تہذیبی اقدار کی بے بضاعتی کو بھی۔ اس سے یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ غافر شہزاد نے منٹو کو کس قدر ڈوب کر پڑھ رکھا ہے۔ (اقتباس)

.....اعجاز روشن.....

کرول گھاٹی کے اس واقعہ کو واقعہ سازوں نے الیکٹرونک اور سوشل میڈیا پر کئی شکلیں دیں جس سے واقعہ ایسی پیچیدہ صورت اختیار کر گیا کہ بات واقعہ نگاری اور واقعہ سازی تک پہنچ گئی جو امیج میکنگ کہلاتی ہے۔ یہاں کئی سچ نمودار ہوئے اور اصل سچ مسخ ہو گیا۔ اس سارے صحافتی، سرمایہ داری نظام، گلوبلائزیشن اور مابعد جدیدیت کے رخ سے بے باک اور نڈر منٹو (اصل غافر شہزاد) نے نقاب نوچ اتارا ہے۔ صحافت کی دنیا میں مسئلہ خبر چھاپنا نہیں بلکہ اسے انسانی سماجی نفسیات پر اثر انداز ہونے والے تناظر میں پیش کرنا اہم مسئلہ ہے۔ جن کا مقصد سچ تک رسائی نہیں بلکہ استحصالی قوتوں کو تقویت دینا ہے اور سچائی تک رسائی کیسے ہو کہ بقول ناول نگار زندگی اور موت ہی سچ ہے جن کے بیچ سب جھوٹ ہے۔ (اقتباس)

.....قیصر نذیر خاور.....

'کرول گھاٹی' بھی ایک ایسی ہی فکشن ہے جو اپنے انگ میں اچھوتی اور منفرد ہے۔

کہیں بیانیہ ہے کہیں اسکرپٹ رائٹنگ اور کہیں تجزیاتی مباحث اور مکالمہ --- اور مکالمہ بھی اچھوتا۔ بھلا پہلے کبھی ایسی فکشن لکھی گئی؟ شاید نہیں کہ آپ موٹروے پر پیش آئے 'ریپ' (Rape) کے ایک واقعے کو بیس (base) بنائیں اور منٹو کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے ایسی تلخ سچائیوں کا پردہ چاک کریں جس کی لپیٹ میں سارا سماج، اس کے ادارے، اس کا ادب، اس کے فنون لطیفہ، اس کا پرنٹ، الیکٹرونک و سوشل میڈیا آیا ہوا ہے۔ (اقتباس)

.....علی اکبر ناطق.....

یہ ناول بھی کونین کی گولیاں ہیں۔ نگلتے ہوئے تالو خشک اور گلا تلخ ہو جاتا ہے۔ ناول کی تکنیک بھی عجیب ہے۔ موضوع مَیں نہیں بتاؤں گا مگر یہ بتاؤں گا کہ منٹو کو اینکر کے سامنے بٹھا دیا گیا ہے یا یوں کہیں کہ اینکر کو منٹو کے سامنے بٹھایا گیا ہے اور منٹو کی زبان سے پورے سماج کو چیتھڑے کر دیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے رنگ روڈ پر ہونے والے واقعے کو اِس ناول میں بنیاد بنا کر مختلف طبقوں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی منافقت کی بخیہ کنی کی گئی ہے۔ کیا پولیس، کیا میڈیا اور سوکالڈ دانشور، ادبی نقاد اور ابن کی بے بصیرتی، اسٹیبلشمنٹ کے بوزنے اور ابن کے بوزنہ فیصلے۔ (اقتباس)

.....نیلم احمد بشیر.....

''کرول گھاٹی'' بلاشبہ پڑھنے والے کو دل کی گھاٹی تک لے جانے میں کامیاب ٹھہرتا ہے-- ناول زیادہ ضخیم نہیں، سو جلدی پڑھا گیا۔ موضوع اہم اور دلچسپ تھا جسے انھوں نے سلیقے سے نبھایا۔ فلم کی دنیا میں اب ایک نئی صنف دیکھنے میں آتی ہے جسے ڈاکو ڈرامہ docudrama کہا جاتا ہے، جس میں حقیقت اور فکشن دونوں کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے-- غافر شہزاد کے دونوں ناول پڑھ کر مجھے ایسا ہی محسوس ہوا کہ یہ docu.novel کی تکنیک پر لکھے گئے ناول ہیں۔ کیا خوب بات ہے کہ آج کا لکھنے والا حقیقت کی دنیا کی کنکر ڈھیری میں سے فکشن کے ہیرے چن لیتا ہے اور یوں جدید ادب کے رجحانات نئی

جناب پروفیسر سعادت سعید، جناب غافر شہزاد اور جناب نجیب جمال۔

سے نئی شکل اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ (اقتباس)

.....سیمیں کرن.....

یہ اردو ادب میں ایک شاندار تجربہ ہے۔ جب کرول گھاٹی کے مقام پر یہ وقوعہ ہوا تب میڈیا کیا کر رہا تھا؟ ٹی چینل کیسے اس کو کور کر رہے تھے؟ سوشل میڈیا پر مقتدر قوتوں نے کیا کھیل رچا رکھا تھا؟، ناول میں دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے غافر شہزاد نے نئے الفاظ متعارف کرائے ہیں وہ ''واقعہ ساز'' اور'' کیمرا کباڑ'' ہیں جو پڑھنے میں لطف دیتے ہیں۔ اینکر پرسن ناول نگار کی تکنیک سے جس طرح اپنا پروگرام مرتب کرتا ہے اور جس طرح اس کی معاونت کرنے والے کاپی رائٹر، پروڈیوسر، رپورٹر، اس کو سب کچھ مہیا کرتے ہیں، بہت حقیقی انداز میں صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ ناول کی خاصیت اس نکتے پر ہے کہ جدیدیت کے باوجود سچ کی تلاش ایک معمہ بن چکی ہے اور جو جھوٹ ہے وہ بھی اس لمحے کا ایک سچ ہی ہوتا ہے۔ غافر شہزاد نے ایک لحاظ سے پہلی بار یہ نئی تھیوری متعارف کرائی ہے ورنہ اس سے پہلے سچ سچ تھا اور جھوٹ جھوٹ تھا اور کرداروں کی تمام کشمکش اس کے گرد گھومتی رہی ہے۔ (اقتباس)

.....محمود پاشا.....

'کرول گھاٹی' اپنی نوعیت کا وہ واحد ناول ہے جس میں میڈیا سے وابستہ مسائل پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانک یا سوشل میڈیا) جو اس وقت ایک انڈسٹری کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور اس سے وابستہ کہانی کار اور قلم کار حصولِ زر کے لیے حالات و واقعات میں ایسا ایسا غیر فطری اور غیر منطقی رنگ بھرتے ہیں کہ عقل ششدر رہ جاتی ہے۔ غافر شہزاد کہانی میں سے وہ وہ امکانات ڈھونڈ نکالتے ہیں جن کا حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا اور یہ سب کہانی تلاش کرنے، میڈیا کی ریٹنگ بڑھانے اور پیسے کمانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ (اقتباس)

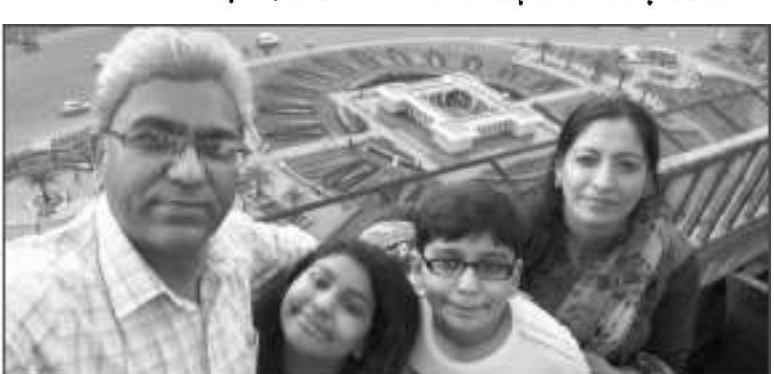

جناب غافر شہزاد اپنے اہل خانہ کے ساتھ۔

استغاثہ (ناول)

.....ڈاکٹر وحید احمد.....

یہ ایک حساس گورنمنٹ سرونٹ کا استغاثہ ہے جو وہ عدالت میں پوری ایمان داری سے پیش کرتا ہے - ایک شریف النفس آرکیٹکٹ اور نقشہ نویس سے زمانہ کس مکاری سے پیش آتا ہے، یہ اس ناول کا بنیادی پلاٹ ہے- پبلک سرونٹ اور سول سرونٹ میں اتنا فرق کیوں ہے - سول سرونٹ کو اکثر مالی جرائم میں استثنیٰ حاصل ہے- سول سیکرٹیریٹ میں فائلیں کیسے چلتی ہیں- بڑے افسروں کے جرائم کا بوجھ نچلے ملازمین پر کیسے ڈالا جاتا ہے- پیپرا رولز کا معمہ کیا ہے؟ ٹینڈر کیسے لکھے جاتے ہیں، کیسے کھلتے ہیں اور ان کی تشریح کیسے ہوتی ہے؟ سائل عدالت میں کیسے آہ وزاری کرتا ہے؟ جج مقدمہ کیسے سنتا ہے؟ مقدمے کا جدلیاتی نظام کیا ہے؟ مقدمے کی جرح کس طرح Hegelian Dialecticism جیسی ہے؟ استغاثہ اور مخالف پارٹی کیسے thesis اور antithesis ہیں؟ عدالت کا فیصلہ پھر سے نیا thesis کیسے بن جاتا ہے؟ ایک اور دفاعی antithesis کیسے آجاتا ہے؟ مصنف کا استغاثہ کس طرح ہیگل کی جدلیات کے برعکس ہے؟ یہ استغاثہ کس طرح Marxist dialectical materialism کی شکل ہے؟ معاشرہ کتنا پیچیدہ ہے؟ حکومتی ادارے کتنے گھناؤنے ہیں---؟ یہ ہیں وہ سوال جو اس ناول میں اٹھائے گئے ہیں اور ان کے جواب کھل کر اور بین السطور دیے گئے ہیں-(اقتباس)

.....ذوالفقار احسن.....

ناول نگار نے کرپٹ سرکاری ملازمین کے چہروں سے جو نقاب ہٹایا ہے وہ دراصل ناول نگار کے ضمیر کی آواز بھی ہے- سرکاری دفاتر میں ہونے والی سازشوں، تبادلوں، انکوائریوں کے بارے میں صحافیوں کے کردار کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح مختلف دفتروں کی خبروں کو حاصل کرتے ہیں اور پھر سرکاری افسران کو بلیک میل کرتے ہوئے مال بناتے ہیں- بعض اوقات صحافی

جناب مستنصر حسین تارڑ اور جناب غافر شہزاد-

جناب ڈاکٹر غافر شہزاد، جناب منو بھائی-

خود ہی مختلف سرکاری افسروں کے خلاف مقدمہ درج کرا دیتے ہیں اور پھر ان سے طرح طرح سے مال بٹورتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر غافر شہزاد نے اپنے عہد کے اس بدنما داغ کو معاشرے کے لیے سم قاتل قرار دیا ہے۔ ناول نگار نے انسان کی خودغرضی، حرص اور طمع کی حقیقی تصویر کو منشی پریم چند کے افسانے ''کفن'' کے دو مرکزی کرداروں گھیسو اور مادھو سے تعبیر کیا ہے۔ (اقتباس)

استغاثہ (ناول)

.....ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ.....

غافر شہزاد کا حال ہی میں شایع ہونے والا ناول ''استغاثہ'' اپنے اندر غلامی کی نئی جہت متعارف کراتا ہے جو جدید ریاست اور اس کے انتظامی اداروں کے اسٹرکچر میں سرکاری ملازم کی ہے۔ اس غلامی سے ایک فرد کی نفسیاتی اور ذہنی سطح پر کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟ اور کس طرح اختیارات اور قانون کی جکڑ بندیوں میں اس کی زندگی سے تحرک اور تغیر کو منہا کر دیا جاتا ہے۔ کیسے اس کی تخلیقی اور انتظامی صلاحیتوں میں سڑانڈ آنے لگتی ہے؟ انصاف کے لیے جب وہ جج اور عدالت کے جال میں پھنستا ہے تو کیسے اس کی برین واشنگ ہوتی ہے۔ اداروں کو کاروباری اڈے بنانے والے کہاں کہاں ایسے ملازمین کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال میں لاتے ہیں اور ٹشو پیپر کی طرح دفتر کے ڈسٹ بن میں ناکارہ بنا کر پھینک دیتے ہیں۔ یکسانیت کا شکار یہ لوگ گرفتِ لیل و نہار میں آ کر کیسے اپنی فطری صلاحیتیں زنگ آلود کر بیٹھتے ہیں؟ (اقتباس)

.....ڈاکٹر شاہین مفتی.....

غافر شہزاد کا ناول ''استغاثہ'' اس کے اولین ناول ''مکھی میں مرگ'' کی ہی اضافی و توسیعی صورت حال ہے۔ ناول کے انتساب نے پہلی نظر میں ہی مجھے چونکا دیا ہے اور میں شعوری سطح پر جارج آرایل کے ناول 1984 کے بگ برادر کے بارے سوچنے لگی ہوں جو ''کہیں نہیں ہے اور ہر کہیں ہے''۔ ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی فضا میں جس طرح ہمارے مذہبی رہنما قہار اور جبار کے غیر مرئی تصور کو ہمارے پراگندہ ذہنوں پر مسلط کر کے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرتے ہیں اور پھر از راہِ تفنن، کبھی کبھار یہی ڈنڈا بردار ہستی لم یزل مظلوم انسانوں کے ریوڑ پر اپنی عنایات کی بارشیں کرتی اور انھیں من و سلویٰ سے نوازتی دکھائی دیتی ہے تو ذہن میں پہلے سے جاگزیں خیر اور برکت کی سب داستانوں پر مطلق سچائی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ناول کا ایک اہم کردار ''بڑا صاحب'' بھی غیب کی خبر رکھتا ہے۔ وہ بھی علیم اور بصیر ہے اور اس کی نادیدہ گرفت سے سب پناہ مانگتے ہیں۔ اپنی میز پر رکھی گھنٹی کو وہ ''کن'' کا نام دیتا ہے۔ بڑے صاحب کی موجودگی ہی وہ مرکزہ ہے جس کے گرد قانون اور مخلوق ایک دائرے میں سفر کرتی رہتی ہے۔ غافر نے اپنے ناول کا انتساب اسی بڑے صاحب کے نام کیا ہے۔ (اقتباس)

☆☆☆☆☆

دو بہنیں نکلیں نہانے

چند گھروں پر مشتمل گاؤں تھا اور کچھ ہی دور ایک ندی۔ ندی سے پرے جنگل۔ کوئی شاذ ہی اُدھر کا رُخ کرتا۔ اُدھر جانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ضرورت کی سب چیزیں گاؤں والے خود ہی کھیتوں میں اُگا کر لیتے تھے۔ خدا کا کرنا، ایک گھر میں دو جڑواں بہنوں نے جنم لے لیا۔ گاؤں والے جانتے تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ دونوں ایسی ہم شکل تھیں کہ جو کوئی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ دیکھنے والا یہ طے نہ کر پاتا کہ دونوں میں سے کون چھوٹی ہے اور کون بڑی۔ ماں تک دھوکا کھا جاتی۔ ماں نے پہچان کے لیے سیدھی سادی بیٹی کو جو ایک طرح سے اللہ میاں کی گائے تھی سبز لباس پہنانا شروع کر دیا اور دوسری اڑیل اور شوخ رنگوں کی شوقین تھی اُس نے اپنے لیے سرخ رنگ چن لیا۔ سبز رنگ کے لباس والی کو لوگوں نے نیکی کا نام دے دیا۔ اس طرح سے دوسری کا نام بدی پڑ گیا۔ نیکی کم کھاتی تھی مگر بدی بسیار خور تھی۔ نیکی کو دوسروں کے دُکھ درد بانٹنے کا ٹھرک تھا تو بدی کو انوکھا رستہ چلنے کا ہٹرک۔ نیکی کو سر درد ہوتا اور وہ ماں کی بتائی ہوئی جڑی بوٹی کھاتی تو بدی بھی سر پکڑ کر وہی کچھ کھا لیتی۔ جڑی بوٹیاں کھانے کی وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں پینا ڈول تو ہوتی نہیں تھی۔ دوائیں ہر اِک کو یکساں سکون پہنچاتی ہے اور کسی سے یہ نہیں پوچھتی کہ تُم کس پارٹی کو ووٹ دیتی ہو۔

خیر جو کوئی ان دونوں بہنوں ایک ساتھ دیکھتا تو حیرت کرتا اور بولتا .....واہ مولا تیرے رنگ۔ رنگوں کی تاثیر آغاز سے ایک جیسی ہے۔ سرخ رنگ جذبات میں ہلچل مچاتا ہے اور سبز رنگ شانت۔ اس سے پہلے کہ کہانی آگے بڑھتی کسی نے تربوزی کو ٹوکا۔

اسلام عظمی

''نیکی بدی کے کرداروں کا قصہ خلیل جبران نے لکھا ہے۔''

تربوزی بھڑک اٹھا اور کہنے لگا'' میں نے کب کہا ہے کہ خلیل جبران نے نہیں لکھا۔ میں تو یہ بتانے لگا ہوں کہ کہانی رُکتی نہیں، رواں رہتی ہے اور تم نے اُن کے بارے میں تو کبھی کچھ نہیں کہا، جو گزرے اور کبھی کبھی گئے گزرے دانش وروں کے نام لے لے کر واہ واہ اور ٹھاہ ٹھاہ کر رہے ہیں۔ کبھی کبھار اُن سے پنگا لے کر دیکھو، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ ویسے مرے ہوئے لوگوں کو واہ واہ اور ٹھاہ ٹھاہ سے کیا فرق پڑتا ہے! اُن کی نیک روحیں سوچتی ہوں گی کہ اُن کے نام کی بدولت کسی کی دیہاڑی لگ رہی ہے تو کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے!''.....اعتراض اٹھانے والے کی بولتی بند ہو گئی تو تربوزی گویا ہوا۔ خلیل جبران کی اُس زمانے کی حکایت ہے جب نہانے کا لباس ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مرد دھوتی اوپر نیچے کر کے کام چلا لیتے تو ناریاں ساڑھی سے۔ ناریوں کا من نہانے کو کرتا تو وہ ندی کا رُخ کر لیتیں۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دائیں بائیں نظر ڈالتیں۔ کوئی پُرش نظر نہ آتا تو لباس پرے پھینک کر ندی میں کود جاتیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی کہ ہر جگہ امرالقیس جیسے شاعر تھوڑے تھے جو چسکے لے کر ناریوں بارے شاعری لکھیں۔ کہانی تو کرشن کے ساتھ بھی ایسی ہی جڑی ہوئی ہے۔ خلیل جبران کی حکایت کے مطابق نیکی بدی نہر کے پاس سے گزریں تو اُن کا جی ڈُبکی لگانے کو مچلنے لگا۔ دونوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ کہیں کوئی ایسا نہ تھا جو چشمہ لگا کر اُنھیں گھورتا۔ دونوں نے لباس اتار پھینکے اور نہر میں کود گئیں۔ نہر کے تذکرے سے یہ خیال مت کریں کہ وہ شہر لاہور کی رہنے والی تھیں۔ شہر لاہور سے کبھی ایک سڑک شہر فیروز پور کو جاتی تھی، اُس سڑک کا نام اب بھی فیروز پور روڈ ہے۔ سڑک کو ایک نہر کاٹتی ہے جو گرمی کے دنوں میں طویل سوئمنگ پول بن جاتی ہے۔ دن بھر وہاں میلہ سا لگا رہتا ہے۔ نہر میں نہانے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے تربوز بھی تیرتے رہتے ہیں۔

خیر ہماری کہانی والی بہنوں کے پاس کوئی تربوز نہ تھا اور نہ ہی نہر کنارے وفعہ ایک سو چوالیس کے نفاذ تھا۔ چینلوں کا زمانہ بھی نہ تھا کہ نہانے والوں کی فلم بنا کر عوام الناس کو تڑپاتی۔ موبائلوں کا زمانہ نہ تھا کہ سیلفیاں بنا کر فیس بک پر ڈالی جاتیں یا پھر کم کپڑوں میں شارٹ فلمیں بنا کر اَپ لوڈ

ہوتیں۔ ویسے فیس بک لبرل پلیٹ فارم ہے، جس نے دین کمانا ہے وہ دین کمائے اور جس نے دنیا کمانی ہے وہ دنیا کمائے...... فیس بک والوں کے باپ کا کیا جاتا ہے!

نہاتے ہوئے بدی کو شرارت سوجھی۔ بدی نے جھٹ سے نیکی کے سبز کپڑے پہنے اور یہ جا وہ جا۔ نیکی یہ سب دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ بھاگ کر بدی کو پکڑ بھی نہیں سکتی تھی کہ بدی جب ہم جولیوں کے ساتھ جب دوڑ لگاتی تو سب کو پیچھے چھوڑ دیتی۔ بدی کو یہ ڈر نہ تھا کہ نیکی اسے پکڑ لے گی۔ پکڑے جانے کے ڈر انسانوں کو راہِ راست پر رکھتا ہے۔ بدی کو پکڑے جانے کا ڈر نہ تھا پھر بھی وہ بھاگتی چلی گئی۔ جب رکی تو اُسے خبر ہوئی کہ وہ تو جنگل میں نکل آئی ہے۔ سرسبز پیڑوں کے جھرمٹ میں اُسے گھاس پھونس کی جھونپڑی نظر آئی۔ ساتھ ہی یہ لگا کہ تیز دوڑنے سے بھوک چمک گئی تھی ۔ اُس کے قدم خود بخود جھونپڑی کی طرف اُٹھنے لگے۔

جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا مگر اندر نہ بندے کی ذات ۔ رات اترنے لگی تھی۔ جنگلی جانوروں کے خوف کے باوجود جھونپڑی والے نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

”کوئی ہے کوئی ہے“ کا آوازہ لگا کر وہ جھونپڑی میں گھس گئی۔ جھونپڑی کے وسط میں ایک تھال پڑا تھا جو سبز رومال سے ڈھکا تھا۔ رومال کے نیچے سے پراٹھوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ بدی کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر ”کوئی ہے کوئی ہے“ کی صدا لگا کر بدی پراٹھوں پر ٹوٹ پڑی۔ آخری نوالہ ہاتھ میں تھا کہ جھونپڑی کا مالک آگیا ۔ جھونپڑی کے دروازے پر سفید لباس، سفید ڈاڑھی، سر کے سفید بال۔ بھوئیں سفید مگر آنکھوں میں جلال۔ بابا کا جمال و جلال دیکھ کر بدی بوکھلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بابا نے بدی کے سبز لباس سے یہ اخذ کیا کہ وہ نیکی ہے۔ بدی کو لگا بابا بولیں گے

”اری چٹوری سب چٹ کر گئی ۔ میں کیا کھاؤں گا؟“

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بابا نے کہا تو بس اتنا...... ”مجھے نہیں معلوم کہ پانچ پراٹھوں سے تمھاری سیری ہوئی ہے کہ نہیں۔ سیری نہیں بھی ہوئی تو تمھیں صبر شکر کرنا پڑے گا۔ پاس میں دو گاؤں ہیں مگر جنگلی جانوروں کی وجہ سے رات میں وہاں جانا اور پراٹھے مانگ کر لانا خطرے سے خالی نہیں۔ گاؤں والے دن میں آتے ہیں اور پراٹھے اور دودھ دان کر جاتے ہیں۔ بھوک نہیں مٹی تو مٹکی میں دودھ بھرا ہے۔ تم دودھ نوش کر سکتی ہو“۔ بدی کی نظر جھونپڑی کے کونے میں

پڑے مٹکی طرف چلی گئی۔ بدی کی بھوک مٹ چکی تھی مگر یہ سوچ کر کہ اگر بابا نے یہ دودھ پی لیا تو! بدی نے احتیاطاً مٹکی کا سارا دودھ پی لیا۔

لوگ بابا کے معتقد تھے۔ جب کوئی کشٹ ہوتا تو وہ دوڑے بابا کے پاس آتے۔ آتے ہوئے بابا کے لیے پوٹلی میں پراٹھے اور گڑوی میں دودھ لانا نہ بھولتے۔ سلام کرتے کرکے مدعا بیان کرتے۔ سب سن کر بابا تبسم فرماتے۔ بات یہ تھی کہ بابا نے جوانی ہی میں کلام ترک کر دیا تھا۔ جنگل میں گھومتے ہوئے بابا کی نظر خود رو جڑی بوٹیوں پڑتی۔ بابا نئی جڑی بوٹی چکھ کر دیکھتے۔ بوٹی میں کچھ تاثیر محسوس ہوتی تو سکھا کر محفوظ کر لیتے۔ سائل کی شکایت کے مطابق وہ اُسے جڑی بوٹی کی پُڑی بنا دیتے۔ پھر بابا سائل کو بار دگر دیکھ کر ہاتھ اٹھا دیتے۔ یہ "اب جاؤ" کا اشارا ہوتا۔ سائل بابا کی اِچھا جان جاتا اور اپنی راہ لیتا۔ بابا دنیا ترک کر چکے تھے مگر دنیا داری کچھ کچھ یاد تھی۔ اُنھوں نے بدی سے پوچھا۔

"تُو کدھر سے آئی ہے اور کدھر کا ارادہ باندھا ہوا ہے؟"...... بدی کیا بتاتی کہ وہ بدی ہے مگر اس نے نیکی کا لباس پہن رکھا ہے اور یہ کہ وہ اندھا دھند بھاگنے میں واپسی کا رستہ بھول چکی ہے۔ بابا سیدھے سادے بندے تھے۔ سیدھے سادے بندوں کو کہاں معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ گاؤں شہر بن جائیں۔ شہروں میں لاکھوں لوگ رہیں گے۔ شہروں کا ملانے کے لیے ریل گاڑیاں بنیں گی اور ریل گاڑیاں لوگوں کو کہاں سے کہاں جا پھینکیں گی۔ پھر شاعر میرا جی ایک نظم لکھے گا جس کا عنوان ہوگا "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا"۔ اُدھر نیکی بدی کے لباس میں اکیلی واپس گھر پہنچی تو ماں نے اُسے بدی سمجھ کر نیکی کے بارے میں پوچھا۔ نیکی نے سب قصہ ماں کو سنا تو ماں نے اسے بدی کی من گھڑت کہانی سمجھا۔ نیکی نے حسبِ عادت کم کھایا تو ماں کو حیرت ہوئی۔ ماں رات بھر سوچتی رہی کہ نیکی کہاں رہ گئی ہے اور بدی نے کیوں کم کھایا ہے۔ سونے سے پہلے ماں نے طے کر لیا کہ وہ اگلے دن جنگل میں رہنے والے بابا کے پاس جائے گی اور اُس سے بدی کی بھوک اور نیکی کی گمشدگی کے بارے میں پوچھے گی۔ اگلے روز جب ماں بابا سے ملنے گئی تو بابا کی جھونپڑی خالی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جھونپڑی میں کبھی کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

''اوقات''

توفیق کے آفس کا لاک خراب ہوا تو اس نے چپڑاسی سے کہا۔

''کارپینٹر کو ابھی لے کر آؤ...دفتر میں بے شمار فائلیں رکھی ہیں...ان کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے''۔ چپڑاسی اس کی کرسی کے سامنے کھڑا مخاطب ہوا۔

''صاحب جی آپ فکر نہ کریں....جتنے بھی سرکاری کارپینٹر ہیں ان میں محمد علی سب سے محنتی ہے....اس کو ابھی لے کر آتا ہوں....اگر تالا بھی بدلنا پڑے تو وہ بھی بدل دے گا۔ صفدر نے اپنے سر کی ٹوپی کو درست کیا...اور جھٹ سے باہر نکل گیا....صفدر کی کوشش ہوتی کہ توفیق کا ہر حکم بجا لائے....موٹر بائیک پر بیٹھے بیٹھے کئی منصوبے بنانے لگا....تاکہ توفیق کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے اور کلرک کی جاب حاصل کر لے....جونہی وہاں پہنچا تو علی محمد فون پر اپنی محبوبہ سے بات کر رہا تھا....حال ہی میں اس کی منگنی ہوئی تھی...اس وقت وہ اس سے باتوں میں مصروف تھا''۔ صفدر کو سامنے کھڑے دیکھ کر رو کھائی سے بولا۔

''دیکھا نہیں میں بہت ہی ضروری فون کر رہا ہوں''۔

''مجھے معلوم ہے...مگر صاحب اس وقت تمہیں بلا رہے ہیں...دفتر کا لاک خراب ہو گیا ہے''۔

''اور بھی لوگ ہیں کسی ایک کو لیجاؤ''۔ اس نے بے رخی سے کہا۔

''دیکھو علی....صاحب نے تمہیں طلب کیا ہے...فوراً موٹر بائیک پر بیٹھو''۔

علی نے صاحب کا نام سنا تو اپنی منگیتر سے کہا۔

''اس وقت جا رہا ہوں شام کو فون کروں گا. بڑے لوگوں کی باتیں ہی نرالی ہوتی ہیں''...خدا حافظ فون بند کر کے وہ صفدر کے ساتھ توفیق کے دفتر پہنچا...بڑی کوشش کرتا رہا....تالا ٹھیک ہو جائے....مگر مایوسی سے توفیق کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''سر نیا لانا ہوگا...ہم ابھی جا کر لے آتے ہیں''۔

توفیق نے اس کی جانب دیکھا....تو وہ بڑا مسکین سا دکھائی دے رہا تھا. جینز کی پینٹ جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی....اس کے اوپر میلی سی ٹی شرٹ اس کی غربت کا مظاہرہ کر رہی تھی. بس ابھی لے کر آؤ...میں نے گھر بھی جلدی جانا ہے.

''جی بہت اچھا''

وہ صفدر کو وہیں چھوڑ کر اکیلا ہی چلا گیا....مارکیٹ قریب ہی تھی اور تالا لاکر ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے نیا تالا لگا

بلقیس ریاض

دیا...اور توفیق کو دیکھ کر کہا۔
''بہت اچھا تالا لایا ہوں''۔
''گڈ''۔ پھر توفیق نے اس کی جانب دیکھا۔
''یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے...پھٹے کپڑے پہنے ہیں''۔ وہ ہچکچایا صاحب جی ایک ماں اور دو بہنیں ہیں منگائی اس قدر ہے اگر اپنے کپڑے بنالوں تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا۔ صبح چائے کے ساتھ روٹی کھالیتے ہیں اور بس سارا دن کچھ نہیں کھاتے...رات کو اماں دال اور روٹی کھلا دیتی ہیں...کبھی کبھی تو دال روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی...وہ آبدیدہ ہوتے ہوئے توفیق کو دیکھنے لگا۔
''صبح گھر آنا کچھ پرانے کپڑے میں تمہیں دے دوں گا۔ دفتر میں صاف ستھرے کپڑے پہنا کرو''۔
وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔
''جی بہت اچھا''۔
چپڑاسی نے کمرہ لاک کیا...ڈرائیور پورچ میں گاڑی لے آیا اور توفیق گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ علی نے پوچھا۔
''صاحب جی صبح کتنے بجے میں آؤں''؟
''تم نو بجے سے پہلے آجانا بیگم صاحبہ تمہیں کپڑے نکال دیں گی''۔
''جی بہت اچھا''
توفیق گاڑی میں بیٹھ گیا اور علی مسکراتا ہوا واپس چلا گیا...رات بھر بارش ہوتی رہی....بارش کے بعد چار سو نکھرا نکھرا سبزہ اور ٹھنڈی ہواؤں میں فٹ پاتھ پر پیدل چلتے ہوئے وہ فون پر مصروف تھا...منگیتر خالہ کی بیٹی تھی...اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی شادی کر لے مگر ماں نے کہہ دیا تھا کہ پہلے بیٹیوں کی شادی کرے گی مگر ان کے اتنے وسائل ہی نہیں تھے کہ وہ بیٹیوں کی شادی کر سکیں...محمد علی تھا تو غریب گھرانے کا مگر شکل صورت اللہ نے بڑی اچھی دی تھی...اچھے لباس میں کوئی اسے پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے....
صغرا سے باتیں کرتے کرتے....وہ توفیق کے بنگلے میں نو بجے سے پہلے ہی پہنچ گیا....اور توفیق کا انتظار کرنے لگا تاکہ گاڑی میں بیٹھنے لگے تو دل کی بات کر لے۔
نو بجے کے قریب توفیق گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ علی نے التجا کی۔
''سر...میں نے ایک ضروری بات کرنی ہے''
....توفیق گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پوچھنے لگا۔
''کہو''
''سر جی آپ مجھے کار پینٹر سے شفٹ کر کے اپنے گھر ملازم رکھ لیں میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ گاڑی چلانی آتی ہے...کھانا بھی بہت اچھا بنا لیتا ہوں اور کار پینٹری کا کام بھی گھر میں کر لوں گا۔ آپ اپنے جو خانساماں کے ساتھ کام کرتا ہے اس کو دفتر میں شفٹ کر دیں....میرا ٹیسٹ لے لیں بہت سارے کاموں سے اللہ نے مجھے نوازا ہے...اگر میری ڈرائیوری اچھی لگی تو بچوں کی گاڑی کیلئے مجھے بھرتی کر لیں''۔
''اچھا...میں بیگم صاحبہ سے بات کروں گا۔ وہ تمہارا ٹیسٹ لے لیں گی''۔

وہ خوش ہوتے ہوئے۔
"صاحب جی اللہ آپ کو دنیا بھر کی خوشیاں عطا کرے"... جاتے جاتے توفیق نے کہا۔
"بیگم صاحبہ سے کپڑے لے کر جانا"۔
"جی بہت اچھا"
"توفیق کو دفتر جانے کی جلدی تھی"۔ علی کو بیگم صاحبہ نے اندر بلا لیا اور اس کا انٹرویو لیا... علی نے اس کے ساتھ بھی وہی باتیں کی..... بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔
"تم آج ہی مالی کے ساتھ پچھلے لان میں سبزیاں لگانے کیلئے بیج لے کر آؤ"۔
مجھے جی مالیوں کا کام بھی آتا ہے.....وہ مالی کی موٹر بائیک پر بیٹھ کر نرسری سے بیج لے آیا...اور سبزیاں اگانے کیلئے زمین تیار کروانے لگا۔ علی کو دیکھ کر باقی ملازم بھی کام کرنے لگے...اتنی خوبیاں دیکھ کر بیگم نے اسے جلدی جلدی رکھ لیا اور توفیق سے کہا۔
"ایسا ملازم کہاں سے ملے گا.... پانچ بندوں کا کام اکیلا ہی کرے گا میں تو اسے ضرور رکھ لوں گی۔ غرض کہ علی بطور ڈرائیور بھرتی ہو گیا اور گھر کا ہر کام کرنے لگا۔ توفیق نے بہت سارے کپڑے جو کافی پرانے تھے...دے دیے...علی سارے ملازموں کے اوپر اپنے آپ کو سمجھنے لگا...توفیق کے کپڑے اس کو بڑے فٹ آئے...اچھے اچھے کپڑے پہن کر وہ گھر کا نگران بن گیا...توفیق نے بہت کہا کہ مالی کی پوسٹ پر تمہیں رکھ لیتا ہوں...مگر وہ بضد تھا کہ ڈرائیور بھرتی کریں....بیگم کی سفارش پر توفیق نے اسے رکھ لیا اور اس کا لائسنس جو دو سال سے بحال نہیں ہو رہا تھا...دوبارہ سے بنوانے کی کوشش کی...اور جلد ہی اس نے ڈرائیونگ کورس بھی پاس کر لیا اور بچوں کو سکول لے بھی آتا اور چھوڑنے کے بعد جب ہوم ورک سے فارغ ہوتے تو انہیں پارک بھی لے جاتا...توفیق کے کپڑے پہن کر اور گاڑی کی چابی ہاتھ میں لے کر اس کا رویہ سب ملازمین پر بھاری ہو گیا...ہر ایک سے اکڑ کر بات کرتا...توفیق کے گھر کام کرتے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا...سارے گھر میں سب کو علی کی عادت سی ہو گئی تھی...چھوٹے سے چھوٹا کام بھی ہوتا تو بیگم اسے کہتی ذرا باورچی کو جا کر کہو کھانے میں آئل کم ڈالے...بیگم صاحبہ کی بات سن کر وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر اپنی نگرانی میں کام کرواتا اور دل ہی دل میں سوچتا کہ ان کا کہا مانوں گا تو زندگی بھر ٹکا رہوں گا"۔
ایک صبح ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی...علی بچوں کو سکول چھوڑنے گیا ہوا تھا...بیگم اپنے کمرے سے کھلے آسمان کو دیکھ رہی تھی اور خنکی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی اور بارش کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا کبھی بند ہو جاتی ہے کبھی پھر شروع ہو جاتی ہے لیکن اس کو وہ سماں بہت ہی حسین دکھائی دے رہا تھا پھر اس نے دیکھا کہ سامنے گھر سے اس کی سہیلی سڑک پار کر کے اس کے گھر آ رہی تھی....وہ آئی اور کھڑکی کے پاس آن کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔
آسما برا نہ ماننا ایک بات کہوں۔
"پلیز اندر آ کر کہو"

سہیلی نے کہا ابھی بہت جلدی میں ہوں ایک بات بتانی تھی تمہیں۔
''اچھا پھر کہہ دو ایسا نہ ہو کہ تم بھیگ جاؤ''۔
''آپ کا ملازم دیکھتے ہی دیکھتے بڑا خود سر ہو گیا ہے... میرے میاں بتا رہے تھے کہ جب گھر سے نکلتا ہے تو اتنی تیزی سے گاڑی چلاتا ہے کہ دائیں بائیں دیکھتا ہی نہیں''۔
''اچھا'' آسما فکر مند ہو گئی.... وہ واپس آئے گا تو میں پوچھوں گی۔
بلکہ سختی سے منع کریں... بڑا مغرور ہو گیا ہے... میرے ڈرائیور کو کہتا ہے کہ میرے معاملات میں کوئی دخل نہ دے... اپنی حد میں رہ کر بات کرو... تمہارے میاں کے کپڑے پہن کر اکڑ اکڑ کر چلتا ہے۔
''فکر نہ کرو... ڈانٹوں گی''۔ رافیہ مطمئن سی اپنے گھر چلی گئی.... آسما پریشان سی علی کا انتظار کرنے لگی۔ مگر وہ ایک گھنٹے کے بعد آیا۔
آسما نے غصے سے پوچھا۔
''اتنی دیر لگا دی ہے... کہاں تھے؟''
''ٹریفک میں پھنس گیا تھا''۔
''لیکن اتنی تیز گاڑی کیوں چلاتے ہو؟''
بیگم صاحب آپ کو کس نے کہہ دیا... ضرور ساتھ والوں نے کہا ہوگا۔ ان کے ڈرائیور نے بتایا ہوگا۔
''سامنے والی بیگم صاحبہ آئی تھیں''۔
وہ ہنس پڑا۔
''آپ کو کیا پتہ ان کا ڈرائیور مجھ سے بہت جلتا ہے... اس نے ان کو سکھایا ہوگا۔ وہ.... ہر وقت میری ٹوہ میں رہتا ہے.... کہ میں اتنا منظور نظر آپ کا کیوں ہوں''۔

''لیکن... اس کے میاں نے دیکھا ہے''۔
''آپ فکر نہ کریں آپ کے بچوں کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے یہ ان کے ڈرائیور کی شرارت ہے۔ بڑی سوچ سمجھ کر گاڑی چلاتا ہوں... آپ فکر نہ کریں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دونگا''۔
آسما مطمئن سی ہو گئی.. اور کچھ ہی دیر میں رافیہ کی باتوں کو بھول گئی۔
شام کا وقت تھا.. موسم بڑا ہی سہانا تھا.. آسما اور توفیق اپنے لان میں بیٹھے تھے... رنگا رنگ پھول ہوا کے ہلکوروں میں جھوم رہے تھے .. توفیق آسما کو کہہ رہا تھا... میرے دوست کی شادی ہو رہی ہے... ہمیں لاہور جانا ہوگا.. تیاری کرنے کیلئے پورا ایک دن دے رہا ہوں۔
ابھی توفیق نے اتنا ہی کہا تھا کہ علی چائے کے ساتھ پکوڑے لے آیا.... دونوں کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دیتے ہوئے کہنے لگا۔
''صاحب جی کل آپ کہہ رہے تھے کہ لاہور جاؤں گا۔ کیا میں چلوں ساتھ''۔
توفیق نے کہا۔
''میرا خیال ہے... تم نے کافی عرصے سے چھٹی نہیں کی... ہماری غیر موجودگی میں چھٹی کر لو... بس دو دن کے بعد ہم آجائیں گے... تم اپنے گھر والوں کی خبر بھی لو''۔
وہ ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے بولا۔
''صاحب جی آپ کتنے اچھے ہیں... میرا کتنا خیال کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے... زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے... گھر کا چکر بھی لگا لینا... اور گاڑی کے ٹائر بھی دکھا دینا... سب

ٹھیک ہیں"۔

"آپ فکر نہ کریں...ایک چکر ضرور لگاؤں گا...کہیں نہیں جاؤں گا میرا وعدہ ہے"۔

دوسرے دن توفیق آسما اور بچوں کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا۔ اس روز سارے راستے ابر چھایا رہا.... مسلسل بارش ہوتی رہی.... خدا خدا کر کے وہ لاہور پہنچ گئے.... پیچھے سے علی اپنی ماں اور بہنوں کی خبر لینے کیلئے گھر چلا گیا....ماں اس کو دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھی....تقریباً ان کے گھر کے حالات بہت ہی اچھے ہو گئے تھے..آسما اور توفیق اس کا اچھا کام دیکھ کر ٹپ بھی دے دیا کرتے تھے...آسما اپنے کپڑے اس کی ماں اور بہنوں کو دے دیتی تھی.

ایک دن تو علی نے ان کے ساتھ گزارہ اور دوسرے دن صغرا کو فون کیا۔

"کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں....یہ کیسی نوکری ہے تیری جو تو وہاں سے نکل ہی نہیں سکتا"۔

بس ابھی کچھ مہینے اور انتظار کر لو....دو دن کی چھٹی لے کر مری آؤں گا۔

"دو دن کی چھٹی کیوں لو گے....آج ہی آجاؤ...جلدی گھر واپس چلے جانا"۔

"آج نہیں آسکتا...بارش ہو رہی ہے"۔

"اچھا کل صبح آجاؤ...شام کو واپس ہو جانا.... پتہ نہیں وہ پھر کب چھٹی دیں"۔

ماں نے دوسرے کمرے سے فون سنا اور پوچھا۔

"کس کا فون تھا؟"

"وہ اماں چوکیدار کا فون تھا کہہ رہا تھا کل بنگلے میں صبح آجانا....مالک کا فون آیا ہے. گاڑی کے ٹائر دکھانے ہیں"۔

"اچھا پھر کل صبح جا کر دوپہر کو چکر پھر لگا لینا"۔

"نہیں اماں میں شام کو واپس آؤں گا اور رات اپنی ماں کے ساتھ گزاروں گا"۔

"اچھا...جیسے تیری مرضی"۔

علی صبح سویرے بنگلے میں پہنچا گاڑی کی چابی لی...اور اس کو سٹارٹ کیا تو چوکیدار بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"علی...بارش ہو رہی ہے...سٹارٹ کرنے کے بعد گاڑی کی چابی مجھے دے دو میں محفوظ کر لوں گا۔ کل صاحب بھی آرہے ہیں"۔

علی نے اس کی جانب دیکھا اور رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے صاحب سے پوچھ لیا تھا.... دراصل میں نے اس کے ٹائر چینج کروانے ہیں۔ آج فراغت کا وقت ہے....صاحب اور بیگم صاحبہ گھر پر نہیں یہ کام کروا لیتا ہوں. یار چھٹی کرو...کتنے مہینوں سے چھٹی نہیں کی. علی نے غصے سے اس کی جانب دیکھا چوکیدار ڈر گیا"۔

"تمہیں معلوم نہیں" سارے گھر کا انتظام میں کرتا ہوں۔ زیادہ ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ کام آج ہی کرنا ہے....وہ اکڑ کر جواب دینے لگا۔ گاڑی سٹارٹ کرنے کے بعد وہ سیدھا بازار گیا..کانچ کی چوڑیاں اور ایک انگوٹھی خریدی اور تیزی سے وہ مری کی جانب گاڑی بھگانے لگا۔ مری سے چند منٹ پہلے ہی چھوٹے چھوٹے اونچے نیچے گھر تھے...اس گھروں میں صغرا کا گھر تھا..علی نے

گاڑی ایک گیراج کے پاس پارک کی اور چڑھائی چڑھتے ہوئے صغرا کے گھر میں دستک دی.....وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی...علی کو دیکھ کر خالہ بھی بیٹھک میں آ گئی...اور بولی۔
"علی بیٹا اتنی زور کی بارش ہے صبح سے تھم ہی نہیں رہی آج نہ ہی آتے"۔
"خالہ...مالک گھر پر نہیں تھے سوچا فارغ ہوں آپ لوگوں کی خیریت پوچھ لوں۔ خالہ اس کیلئے کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی اور علی نے نیلی پیلی کئی رنگوں کی چوڑیاں اس کو دیں...اور انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنائی"۔ صغرا نے دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں نے سوچا سونے کی لاؤ گے"۔
"ارے پیسے جمع کر لوں...شادی سے پہلے سونے کی انگوٹھی ضرور لاؤں گا"۔ خالہ کھانا لے آئی تو بولی۔
"اب جب تک بارش نہیں رکتی تم یہیں رہو...خالہ کا گھر ہے...لیکن میں نے جلدی جانا ہے...شام تک پہنچوں گا صبح مالک آ رہے ہیں"۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جانے کیلئے کھڑا ہو گیا تو خالہ نے کہا۔
"اچھا آہستہ آہستہ گاڑی چلانا...دھیان رکھنا"...علی نے مستی سے جواب دیا اب تو میں چھ ماہ سے بڑی اچھی گاڑی چلا رہا ہوں...بڑا ماہر ہو گیا ہوں...فکر نہ کریں کچھ نہیں ہوتا۔ صغرا اور خالہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نیچے اتر کر گیراج کے قریب گاڑی کھڑی تھی...ہیر کا گانا گاتے ہوئے وہ نڈر ہو کر گاڑی چلانے لگا...صغرا کو مل کر اسے چین آ گیا تھا...جب سے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں آئی تھی وہ جلد ہی اپنی اوقات بھول گیا تھا...ہر ملازم کے ساتھ تلخ لہجے میں بات کرتا...اور کہتا سارے گھر کا نظام چلاتا ہوں مذاق نہیں...اس وقت بھی وہ بھول بیٹھا کہ مالکوں کی گاڑی ہے...گاتا اور جھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا...برستی بارش میں گاڑیاں آ جا رہی تھیں...وہ حسب عادت تیز رفتار سے گاڑی کو بھگا رہا تھا...ابھی آدھا گھنٹہ ہی چلاتے ہوئے ہوا تھا کہ گاڑی سلپ کر گئی اور سڑک پر بے قابو ہو گئی...ایک دم سے بائیں طرف آتی ہوئی گاڑیوں کے سمت سلپ ہوتے چلنے لگی...اچانک ایک گاڑی اسی طرف کو آ رہی تھی اور اس سے بچنے کیلئے گاڑی سڑک کے کنارے لانے کی کوشش میں گاڑی بے قابو ہو گئی اور نیچے ڈھلوان کی گہرائی میں تیزی سے اترتی گئی...اور اتنی بلندی سے گاڑی اوپر سے نیچے گری کہ چٹان کے ساتھ ٹکراتے ہوئے پاش پاش ہو گئی...اور علی کی سانسیں چل رہی تھی۔
اسے ہسپتال میں پہنچایا گیا جب توفیق کو اطلاع ملی وہ سیدھا ہسپتال گیا...تو وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا۔ توفیق گاڑی کے نقصان کو بھول گیا وہ تھی تو سرکاری مگر محمد علی اس کی زندگی تو اپنی تھی اور دو دن کے بعد وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا...اور محمد علی کے بول اس کے کانوں میں اتر رہے تھے میں عمر بھر وفا کروں گا...اور آپ کے ساتھ رہوں گا...مگر توفیق نے آہ بھرتے ہوئے سوچا...وہ تو زندگی بھر کا ساتھ دینے کا کہتا تھا مگر چھ ماہ بھی نہ رہ سکا۔

☆☆☆☆☆

پیار کے دو بول

کسی نے صحیح کہا ہے کہ آدمی کی پہچان رشتوں کے ذریعے ہوتی ہے اور رشتے محبت کی مٹھاس سے بنتے ہیں۔ لیکن یہ محبت ہوتی کیا ہے؟ کیا یہ گوند یا سریش نما کوئی چیز ہے جو بندوں سے جا چپکتی ہے اور پھر چھڑائے نہیں چھوٹتی یا کسی لمبی سی مضبوط رسی کا نام ہے کہ اس کی گرہ میں جو بندھ گئے سو موتی اور جو رہ گئے سو پتھر۔ بات صرف یہ کہنی ہے کہ دو آدمیوں یا ایک بندے اور بندی کا جوڑا اسی محبت کی جڑ سے جڑا ہوتا ہے لیکن اس محبت کی پہچان ذرا مشکل سا کام ہے خصوصاً متاہلانہ محبت کو سمجھنا۔

میرا دوست منیر جوان تھا۔ شکل بھی ٹھیک تھی اور وہ برسرِ روزگار بھی تھا۔ ہم دونوں نے ایک ہی کالج سے پہلے ایف اے کیا اور پھر بی اے۔ منیر شاعر بھی تھا کالج کا انعام یافتہ، دوستوں نے اسے ''شاعرِ عشق'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ ''عشق'' اس کا ''آل ٹائم'' مشغلہ تھا۔

لیکن عشق ہو یا نہ ہو پیٹ میں روٹی کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔ ہم دونوں سرکاری ملازم تھے لیکن اپنی کم آمدنی سے ناخوش، گزارہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک دن ہم دونوں نے سر جوڑ کر کچھ دیر سوچا اور پھر شام کی کوئی جاب ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا کہ ہم دونوں کو ایک ہی اخبار کے دفتر میں شام کی پارٹ ٹائم جاب مل گئی۔ صبح کی نوکری ہم الگ الگ سرکاری محکموں میں کر رہے تھے۔ شام کی جاب ملنے پر اب ہم دونوں ایک ہی دفتر میں اکٹھے ہو گئے اور یوں ایک دوسرے کے ہم پیالہ، ہم نوالہ، ہم راز اور دم ساز بن گئے۔

ہم دونوں کا جوان ولولوں کے ساتھ صبح و شام کی دو دو نوکریاں کرنے کا ایک ہی مقصد تھا غربت کا بوجھ کم کرنا اور دو دفاتر سے ملنے والی تنخواہوں سے گھر والوں کا ہاتھ بٹانا۔ اب قدرے اچھا وقت گزرنے لگا۔

ایک روز جانے اچانک کیا ہوا، منیر کو کسی عجیب سے مسئلے نے آ لیا۔ وہ سخت بے چین ہو گیا، اُٹھتے بیٹھتے ''ہائے اوئی'' کرنے لگا۔

''ارے بھئی منیرے، کیا ہُوا تمھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں''۔

جب کہ اس کی حالت یہ تھی کہ مسلسل بے چینی،

محمد طارق علی

ماتھے پر پسینہ، بار بار حلق میں چائے یا پانی انڈیلنا، ٹھنڈے سانس، گرم آہیں، اخبار کے نیوز روم کی میز پر بیٹھے بیٹھے رقعے نما خط لکھنا اور پھاڑ کر پھینک دینا، کبھی کبھی ہاتھوں میں سر پکڑ لینا اور پھر وہی "ہائے، اوئی" کا ورد۔

"کچھ تو بتاؤ میری جان، شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں"۔

"نہیں، تم نہیں سمجھو گے، ہائے مرا، میرا دل، میرا چین، سب کچھ گیا" میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

منیر تو منھ سے کچھ نہ پھوٹا لیکن چند جہاں دیدہ ساتھیوں نے مجھے بتایا۔ "اسے عشق کی بیماری لاحق ہوگئی ہے، اب یہ کام سے گیا"۔

میں پھر منیر کے پاس جا بیٹھا۔

"کون آگھسی ہے تمہارے اس ننھے سے دل میں، کچھ تو بتاؤ؟"

"ہے کوئی...... مگر...... مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا، کس نے بتایا؟"

"تمہارے اندر کی کھولن نے، تمہاری حرکتوں نے...... ادھر سامنے دوسری میز پر بیٹھے کئی تجربہ کار، جہاں دیدہ اور "بیوی زدہ" کولیگز کی حکیمانہ رائے کے مطابق تمہیں کسی سے محبت ہوگئی ہے اور اب تم کام سے گئے"۔

"ہاں بھائی! تم لوگ مذاق اڑا سکتے ہو، پر جس دل لاگے، وہی جانے"۔

"مگر وہ ہے کون؟ کیا کوئی خوب صورت جھنگن جھاڑو دیتے ہوئے تمہارے دل پر ہاتھ صاف کر گئی یا تمہارے گھر کے سامنے والی تیز طرار ناگن نما گوجری نے یہ کام کر دکھایا یا پھر رمضانی قصائی کی تنومند لونڈیا تم ایسے نادان پر اپنی چھری چلا گئی؟" میں نے پوچھا۔

"فضول گوئی بند کرو" منیر نے زبان کھول کر نہیں دی۔

کافی تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ ملک مکان کی توبہ شکن لڑکی نے منیر کے خالی خولی سے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔ خطوط کے تبادلے، عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے، پہلے گھر کی چھت پر اور پھر پارکوں میں ملاقاتیں لیکن ایک دن ان کے عشق کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ موصوف کو بہ یک بینی دو گوش گھر کی اوپری منزل سے باہر کا راستہ دکھایا گیا۔ ساتھ ہی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق لڑکی کسی امیر گنجے لڑکے کے حوالے کر دی گئی اور وہ اپنے پیا کے ہمراہ جانے کہاں جا بسی۔ یوں محبت کا جنازہ اٹھ گیا۔

بس اس دن کے بعد سے میرا یار مجنوں بن کر رہ گیا۔ "اب شادی کبھی نہیں کروں گا، بے وفائی کا دوسرا نام عورت ہے۔ اسے سچی محبت نہیں، بس گاڑی اور بنگلہ چاہیے تھا، سو یہ چیزیں اسے مل گئیں اور وہ

مجھے ٹھکرا کر چلی گئی"۔

"ہاں بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اب تم بھی اس لڑکی کے نام پر دو حرف بھیجو اور کوئی نئی چڑیا تلاش کر کے اس بے وفا سے پورا پورا بدلہ لو" میں نے کہا۔

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا، میں اس جیسا کم ظرف اور کمینہ نہیں، میری محبت کھری اور سچی ہے، میں نے پیار کا ڈھونگ نہیں رچایا تھا" منیر کا منہ غصے سے سرخ تھا۔

میں چپ ہو رہا اور نئے حالات کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی بہ مشکل سال گزرا ہی تھا کہ ایک اطلاع کے مطابق موصوف بہت شد و مد کے ساتھ گھر گھر جھانکتے پھر رہے ہیں، کبھی اکیلے اور کبھی گھر کی کسی خاتون کے ساتھ۔

"اب کیا ہوا، آج کل تم کسے ڈھونڈتے پھر رہے ہو"۔

"وہ..... وہ..... امی نے مجھے قسم دے کر کہا ہے کہ اب تم فوراً اپنا گھر بسا لو، کب تک لنڈورے بنے رہو گے"۔

"یقیناً والدہ صاحبہ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اب زندگی بھر شادی نہیں کروں گا؟"

"لعنت بھیجو اس رضیہ کی شکل پر، وہ کوئی انسان تھی انسانیت کے نام پر دھبہ تھی"

"اب آئے نہ آنے والی تھاں پر بچو، ایک دفعہ تو شادی کر لے، آٹے دال کا بھاؤ تجھے خود ہی پتہ چل جائے گا"۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرا کر چپ ہو رہا۔

بہرحال رشتوں کی ڈھنڈیا میں کئی چہرے منیر کے قریب آئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تقریباً سبھی نے اس کے ننھے منے سے دل میں جگہ بنا لی۔ ان دنوں وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا لیکن اس "سچے" عاشق کی شادی جلد ہی ایک ہیومیو لیڈی ڈاکٹر سے طے ہو گئی۔ اس کی واحد شرط یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی پریکٹس جاری رکھے گی۔ انہی دنوں اسے کہیں سے یہ بھنک مل گئی کہ اس کے ہونے والے شوہر نامدار مجنوں کے صحیح "جانشین" ہیں۔ لہٰذا ایک "ڈیٹ" پر منیر کو یہ حکم ملا "خبردار، اب میں نہ سنوں کہ تم لڑکیوں کے پیچھے پھر رہے ہو اور ہاں، تم تمام زنانہ خط میرے سامنے لا کر جلاؤ گے۔" چنانچہ تمام رنگ رنگ برنگ خط آگ کی نذر کر دیئے گئے۔ چلو، منیر کا گھر بس گیا، یہ بڑے شکر کی بات تھی۔

ہنی مون تک منیر کے ہاں خیریت ہی خیریت تھی، وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ پھر روٹین لائف شروع ہوئی۔ یہ لائف کیسی ہو گی، میرے دل میں تجسس پیدا ہوا اور ایک روز میرے پوچھنے پر منیر نے کہا "بس یار، سارے صبح و شام روٹین میں ڈھل گئے ہیں، گھر میں

آٹا دال آنے اور چولہا چوکا روشن ہونے لگا ہے، مجھے ہر چیز وقت پر تیار ملتی ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے ماورا بھی ایک بات ہے اگر میں غلط نہیں تو عورت اور مرد بس ایک بات کے لیے جوڑے بنائے جاتے ہیں یا وہ خود ایک ہو جاتے ہیں اور وہ بات ہے...... مرد کے ''شوہر پن'' کے لیے، ایک میٹھا سا پیار بھرا نسوانی اعتراف محبت۔ لیکن رضیہ شادی کے بعد ایک روٹین میں ڈھلی ڈھلائی عورت ہے، جب دیکھو ایک بے بنائے روبوٹ کی طرح نظر آتی ہے''۔ اس نے بات ختم کی اور ایک ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

''لیکن ایسا کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، بلکہ ایک دن میں نے لہجے میں خوب مٹھاس گھول کر رضیہ سے پوچھا۔ ''جانم! ایک بات تو بتاؤ سچ سچ، کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟'' تو اس نے صاف کہا ''ابھی تک تو نہیں ہوئی ہر صبح اٹھ کر دیکھتی ہوں کہ یہ کون بھدی سی شخصیت میرے بیڈ پر قبضہ جمائے لیٹی ہے۔ یا ہر روز شام کے چار بجے یہ کون چشمہ پوش شخص اپنی واہیات سی پھٹ پھٹی پر گھر میں آن ٹپکتا ہے''۔ اس کے بعد منیر خاموش ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وائف کی باتیں سن کر منیر کو بہت مایوسی ہوئی ہو گی لیکن یقیناً اس نے دل کو تسلی دے رکھی ہے کہ رضیہ مذاق کر رہی ہے، بھلا شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں، بہ مشکل سوا یا ڈیڑھ سال۔ بہرحال وہ کبھی نہ کبھی خود ہی اپنی محبت کا اقرار کرے گی۔ دن گزرتے رہے، یہ اپنی مرضی والا کھلا کھلا سا اقرار محبت کبھی نہ ہوا اور منیر کے کان اس کی یہ بات سننے کو ترستے رہے۔ آخر اس نے ایک دن پھر رضیہ سے کہا ''اب تو مان جاؤ کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے''۔

''ہرگز نہیں، میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں کہ چند دنوں کی رفاقت کے بعد عشق جتانے لگوں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے اب مجھے تمہاری موجودگی کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے جیسے گھر کے صحن میں رکھا ہوا یہ بڑا سا سرخ گملا مجھے بھلا لگتا ہے''۔

''ہونہہ، یہ کیا بات ہوئی، ایک اچھے بھلے آدمی کے لیے گملے کی مثال لانا کوئی درست بات نہیں، تمہیں اپنی سوچ میں مثبت تبدیلی لانی ہو گی۔ میں ہر روز صبح سے شام تک پسینہ بہا کر تمہارے لیے اتنا کچھ کرتا ہوں اور تم ہو کہ......''

''معاف کرنا منیر صاحب، محبت روٹین کے کاموں سے پیدا نہیں ہوتی۔ تم سے کہیں زیادہ محنت تو ہماری گلی کا گوالا کرتا ہے، روزانہ دس پندرہ بھینسوں کو چارہ کھلانا، ان کی صفائی ستھرائی اور پھر بائیک پر بے شمار دودھ بھرے ڈبے اٹھا کر پورے شہر میں سپلائی کرتا۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ اس انداز

کار سے وہ اپنی گھر والی کا دل جیت سکتا ہے، وہ اسے زبردستی چند بچوں کی ماں تو بنا سکتا ہے لیکن اس کے دل تک رسائی نہیں پا سکتا، کچھ سمجھ آئی آپ کو؟''

منیر گم صم، اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا، رضیہ اٹھ کر اپنے کلینک چلی گئی۔

یہ سارا قصہ عجیب سا تھا لیکن جانے کیوں میرے دل میں رضیہ بھابھی کے لیے کافی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا، کچھ عرصہ بعد منیر کے ہاں ایک چاند سا بیٹا آ گیا۔ ایک دن اس نے پھر رضیہ سے سوال کیا: ''بتاؤ، محبت کے بارے میں تمہارا وہ بے ہودہ سا خیال اب بھی بدلا یا نہیں''۔

''میری محبت میرے بیٹے کے لیے ہے، یہ مجھے بہت پیارا ہے اور رہے تم، میرے لیے تم صرف اس کے باپ ہو۔''

''ہت تیرے کی'' منیر جھلا کر باہر جانے لگا تو رضیہ پھر بولی ''میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتی''۔

اسی اثنا میں میری بھی شادی ہو گئی۔ میری آبادکاری دیکھ کر منیر اور رضیہ بھابی دونوں بہت خوش تھے اور میرے لیے دعا گو بھی۔ ہنی مون ہنسی خوشی گزر گیا۔ زندگی پھر سے معمول کے دھرے پر آ گئی۔ ایک دن میری بیوی نے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا: ''سچ بتائیے آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔''

''بات یہ ہے محترمہ کہ آج تک کوئی محبت ماپنے کا پیمانہ نہیں بنا سکا''۔ وائف نے منھ پھیر لیا حالانکہ میں نے تو سچی بات کہی تھی، جانے کیوں وہ برا مان گئی۔

وقت آگے بڑھا۔ میں بھی ایک پیارے سے بیٹے کا باپ بنا۔ ''اب بھی آپ کو مجھ سے محبت ہوئی یا نہیں؟'' وائف کی آنکھوں میں پیار کی اچھال تھی۔

میں نے ذہن اور دل دونوں کو ٹٹولا، شاں شاں خالی کے خالی، سو جھوٹ بولنا بیکار سی بات تھی۔

''سچی بات یہ ہے ریحانہ کہ محبت دل میں خودرو پودے کی طرح اُگتی ہے، کوئی بھی اپنے دل میں اس کا بیج یا پنیری نہیں لگا سکتا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، محبت کا کوئی سوئچ نہیں ہوتا کہ جب جی چاہا اسے سوئچ کے ذریعے آن یا آف کر دیا''۔

''لیکن آپ کو محبت ہو نہ ہو، مجھے تو ہے'' ریحانہ اچھل کر مجھ سے چمٹ گئی اور اتنے زور سے بھینچا کہ میں بے بس ہو کر رو گیا۔

''دیکھ لو میرے پاس تو ہے وہ سوئچ اور آن بھی ہو چکا''۔ میں مسکرانے لگا ''واقعی کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، گاگر سے پانی پینا ہو تو آگے بڑھو، اسے ذرا سا جھکاؤ اور اپنا کوزہ بھر لو، فضول جھجک کا فائدہ؟'' میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میرا سوئچ بھی آن ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

لَمطُوس کی موت

لمطوس نے اپنے بارے میں لوگوں کو یہی بتا رکھا تھا کہ وہ سمندری جہاز کی تباہی کے بعد سمندر میں ڈوب کے مرنے والا تھا، کہ لہروں نے اُسے کنارے پر دے مارا۔ جس کی وجہ سے اس کے کمر کی ہڈی ٹوٹنے کے بجائے ٹیڑھی ہو چکی تھی اور اب اُسے اپنی دھنسی ہوئی گردن کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔ لمطوس نے اجنبی لوگوں میں ہر طرح سے خود کو نیک، شریف اور خوش گفتار ثابت کرنے کی کوشش کی اس نے اپنی طرف سے دعائیں گھڑ گھڑا کر مانگنا شروع کیں۔ ایک دن وہ اجنبی لوگوں کی عبادت گاہ کے دروازے پہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن، بھوک، افلاس اور زندگی کے خوف کی وجہ سے تیزی سے کام کرنے لگا۔ لوگوں کو دولت مند اور خوشحال دیکھ کر وہ انہیں یوں خوشامد سے دیکھتا اور مسکراتا۔ جیسے وہ انہی کا بچھڑا ہوا کوئی عزیز ہے۔ جسے وہ پہچان نہیں رہے۔ اس نے بہت تھوڑے دنوں میں لوگوں کے مزاج اور زبان سے آشنائی حاصل کر لی اور ایک دن ہمت کر کے وہ عبادت گاہ میں داخل ہو گیا اونچے اونچے ستونوں کے درمیان سجی ہوئی قربان گاہ دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اپنے پیچھے پیچھے آتے قدموں کی آواز سن کر وہ جھٹ سے

کلیم خارجی

سجدے میں گر پڑا اور مقامی لوگوں کی زبان میں وہ دعائیں مانگنے لگا۔ جو لوگوں نے پہلے کبھی سنی بھی نہ تھیں۔ چند لوگ اس کی دعائیں سن کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک معزز اپنی توند پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ تم نے یقیناً خدا کے خاص بندوں کے درمیان وقت گزارا ہے۔ تمھاری دعائیں ظاہر کرتی ہیں کہ تم نیکی اور روحانیت کے علوم سیکھ چکے ہو۔ چلو آؤ میرے ساتھ آج شام تم میرے دسترخوان سے لطف اٹھاؤ گے۔ لمطوس سجدے سے اٹھ کر اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا اور غلاموں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا عبادت گاہ سے باہر نکلا۔ اور جب وہ معزز شخص کے گھر سے کھانے کے بعد برآمد ہوا تو اس کی زبان جبڑے کے اندر سانپ کی طرح بل کھاتی رہی۔ اس کے کندھے سے ایک تھیلا لٹک رہا تھا جس میں پیتل کے برتن اور کچھ نئے پرانے ہتھیار تھے۔ معزز شخص نے اپنے یہ تمام چیزیں دیتے ہوئے کہا تھا۔ انھیں بیچ کر اپنے لیے رزق اور نام کماؤ، لمطوس نے بہت تھوڑے عرصے میں شہر کے گھروں سے بے کار اور پرانی چیزیں مانگ کر سستے داموں خرید کر دور بستیوں میں جا کر منافع کے ساتھ بیچنا شروع کر دیا۔ لمطوس نے دیکھا کہ بہت سے گھروں کی بے کار اور بے اہم چیزیں دوسروں کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوئی ہیں۔ اس تجربے کے بہت جلد لمطوس اس شہر میں بس گیا۔ اُسے عزت، دولت اور پہچان مل گئی۔ وہ ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں کرایہ پر رہنے لگا۔ اور ساری رات نیک، معزز اور دولتمند ہونے کے خواب دیکھ دیکھ کر اٹھ جاتا۔ اور تنگ اور باریک سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جا کر ان سنی سے دعائیں مانگتا رہتا۔ اس کے پڑوسی شروع شروع میں تو اس کی اس حرکت سے بہت بے زار و پریشان ہوا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اُسے نیک اور عبادت گزار سمجھ کر اس کی عزت کرنے لگے تھے۔ لمطوس کے کمرے میں پرانے برتنوں اور اوزاروں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ وہ روزانہ صبح سویرے اٹھ کر انھیں چمکاتا۔ مرمت کرتا اور اپنے گدھے پر لاد کر دور بستیوں کی طرف نکل جاتا ایک دن اپنے مکان کی طرف لوٹتے وقت لمطوس نے سوچا، اُسے نیک ہونے کا ثبوت دینا چاہیے اُسے مہمان نواز ہونا چاہیے۔ لوگ نیک ہونے کا مظاہرہ کر کے بغیر محنت اور مشقت کے بھی دولتمند اور معزز ہو جاتے ہیں۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ شہر کے بہت سے لوگوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ مگر اپنی بول چال اور ملنے ملانے میں وہ صرف یہ جتاتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح نیکیاں پھیلائیں۔ نیکیوں کے قصے اور واقعات سن کر یقین کر لینے والے بھی خود کو نیک ہی گردانتے دیکھے تھے اس نے ایک دن بھرے بازار میں ایک

معذور شخص کو لوگوں کے سامنے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اے نیک اور محترم بزرگ لگتا ہے تیری دعاؤں میں بہت اثر ہے۔ جبھی تو شہر کے لوگ تجھے جھک جھک کر بھیک دیتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ کسی روز تجھے اپنے مکان پر لے جاؤں۔ تجھے اچھا کھلاؤں اور جو کچھ میرے ہاں تیرے لیے بہتر اور مفید ہو۔ تجھے دے دوں۔ تو بتا کس دن اور کس وقت جانے کے لیے رضامند رہے، معذور اور بوڑھا بھکاری بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ لوگ اُس کا جواب سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے وہ ہکلاتے ہوئے بولا، جب تمہیں آسان لگے، میرے مہربان۔ تم اس شہر کی خوشحالی اور سلامتی کا باعث لگتے ہو۔ میں ضرور تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ پھر ایک صبح جب بازار ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ لمطوس بڑی احتیاط اور عزت سے بوڑھے معذور بھکاری کو اپنے گدھے پر بٹھا کر۔ اپنے وعدے کے مطابق اُسے اپنے مکان کی طرف لے گیا۔

بوڑھے بھکاری نے دستر خوان پہ بیٹھتے ہوئے لمطوس کی بہت تعریف کی۔ اور پھر اس نے اپنی زندگی کے چند واقعات سنائے کہ شہر کے کن کن لوگوں نے اس کے ساتھ فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور قدرت نے اس کے ساتھ حسن سلوک کے بدلے میں انہیں کیسے دولت اور خوشحالی سے نوازا تھا۔ لمطوس یہ سب سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے گھر میں رکھی ہوئی قیمتی چیزوں میں ایک پیلے رنگ کی چادر اس کے لیے منتخب کی۔ جو اس نے اپنے لیے سستے داموں خریدی تھی۔ بھکاری نے عقیدت کے جوش میں لمطوس کے لیے کچھ نئی دعائیں سیکھ رکھی تھی۔ تا کہ وہ بھیک دینے والوں کو متاثر کر سکے۔ لمطوس نے اس کی چادر میں پھل اور عطر کی ایک بوتل بھی لپیٹ دی۔ بھکاری کو گدھے پہ بٹھاتے ہوئے لمطوس نے بڑی شفقت سے کہا اے میرے بزرگ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کے آنا چاہوں گا تا کہ تم وقت سے پہلے پہنچ کر آرام سے سو سکو، لیکن بوڑھے بھکاری نے شکریہ ادا کرتے ہی کہا اسے وہیں پہ چھوڑ دیا جائے جہاں سے اُسے اٹھایا گیا ہے کیونکہ اس کے بالکل سامنے اس کے بیٹے کی دُکان تھی۔ جس میں وہ اناج بیچتا تھا۔ وہ شام کو اپنے بیٹے کے ساتھ گھر جانے کا عادی تھا بھکاری کی باتیں سن کر لمطوس کا لمبوترا منہ لٹک کر ٹیڑھا سا ہو گیا۔ اس کا رنگ سیاہ ہونے لگا۔ وہ خاموشی سے بھکاری کو دیکھتا رہا اور لمبی سے آہ بھر کے بولا آپ نے بتایا نہیں۔ میں آپ کے بیٹے کو بھی ساتھ لے جاتا۔ یوں میرے حصے میں زیادہ نیکیاں جمع ہو جاتیں۔ لیکن لمطوس کا دل گہرے پچھتاوے میں

ڈوب چکا تھا۔ وہ خاموشی سے گدھے کی رسی پکڑ آگے آگے چلتا رہا۔ بازار کے قریب پہنچ کر اپنے ٹھیلے پہ بیٹھتے ہی بھکاری چلایا، لوگوں یہ نیک شخص آج مجھے اپنے مکان لے گیا۔ مجھے اچھے اچھے کھانے کھلائے۔ اور مجھے قیمتی چادر تحفے میں دی بے شک اس جیسے نیک لوگوں کی وجہ سے دنیا قائم اور خوشحال ہے۔ لمطوس کا دکھ اور پچھتاوا کسی حد تک کم ہوا لیکن اس نے دل میں بوڑھے بھکاری پر ہزار لعنت بھیجتے ہوئے اس کے دکاندار بیٹے کے لیے اذیت ناک موت کی دعائیں مانگیں۔

اسی رات لمطوس نیند سے اُٹھا۔ چھت پر جانے سے پہلے اس نے اپنے خریدے ہوئے چاندی کے خوبصورت اور بڑے پیالے کو ہاتھ میں تھام لیا۔ یہ پیالہ اس نے شہر کے قدیم حویلیوں والے علاقے سے سستے داموں خریدا تھا۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی اسے بیچنے کے لیے تیار نہ ہو سکا تھا۔ پیالہ ہاتھوں میں لیے وہ دوسری منزل کی چھت پر پہنچا۔ ایک ٹوٹی ہوئی میز پر پیالہ رکھ کے وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر گڑگڑایا، اے نیکی کا بدلہ دینے والے خدا۔ میں نے یہ خیالی پیالہ تیرے سامنے رکھ دیا ہے۔ اسے میرے لیے بدلے کی خوش قسمتی اور خوشحالی سے بھر دے۔ یارب میرے لیے اس خالی پیالے کو خزانے سے بھر دے وہ سجدے کرتا۔ اٹھتا۔ دعا مانگتا اور پھر سجدے میں گر جاتا۔

کئی راتوں تک ایسا کرنے سے اس کے دل میں اُمیدیں سے جاگنے لگیں تھیں۔ وہ اپنے مکان کو محل اور اپنے گدھے کو خوبصورت گھوڑے کے روپ میں دیکھنے لگا تھا۔

ایک دوپہر سخت دھوپ اور گرمی کی وجہ سے وہ جلد اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ وہ نچلی منزل کے ایک گودام نما بوسیدہ مگر ٹھنڈے کمرے میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ کہ اسے دروازے کے باہر گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اُلجھن میں اٹھا۔ اور دروازہ کھول کے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ اونٹوں کے قافلے جا رہے ہیں۔ اتنے زیادہ اونٹ اور اونٹ پر ساز و سامان سے بھری ہوئی گٹھڑیاں دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اونٹوں پر بیٹھے ہوئے تاجروں کو ہاتھ ہلا کر الوداعی اشارے کرنے لگا۔ ایک اونٹ چلتے چلتے رک گیا۔ اس کے ہودے پر بیٹھے ہوئے ایک تاجر نے سر جھکا کر اسے پکارا اے مہربان نیک آدمی اگر ممکن ہو تو ایک پیالہ ٹھنڈا پانی پینے کے لیے دے کر احسان کر دو۔ لمطوس لپک کر مکان کے اندر آیا۔ اُسے اپنا خوبصورت پیالہ یاد آیا۔ وہ تیزی سے چھت پر گیا۔ پیالے کو دھو کر اس نے اسے ٹھنڈا پانی سے بھرا اور تاجر کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پی کر تاجر نے احسان مندی سے کہا اے مہربان اور خدا ترس آدمی۔ میرے پاس پانی پینے کے لیے کوئی برتن نہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں یہ برتن رکھ

لوں - تاکہ سفر میں میرے کام آسکے۔
لمطوس کو یہ موقع بہت اچھا لگا کہ اونٹ پر بیٹھا ہوا ایک مالدار تاجر اُسے اپنی حاجت بتا کر اُس سے سخاوت کا طلبگار تھا، لمطوس نے یوں ہاتھ ہوا میں پھیلاتے ہوئے کہا، یہ پیالہ تمہارا ہوا، جب بھی اس لیے پیاس بجھانا میرے لیے دعا کے دو لفظ ضرور ادا کردینا، اونٹ پر بیٹھے ہوئے تاجر نے پیالے کو اچھی طرح پرکھ کے اپنی شہادت کی انگلی سے اس پر ضرب لگائی۔ اور پھر خود سے آہستگی میں کلام کرتا ہوا اس نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے ایک تھیلے میں وہ پیالہ احتیاط سے رکھنے کے بعد اُس نے پہلے ایک بڑے تھیلے کا منہ کھول کر اس میں سے بادام کی مٹھیاں بھر بھر کے لمطوس کے دامن میں ڈال دیں۔ پھر اس نے ایک اور سرخ رنگ کا تھیلے کی گرہ کھولی اور اُس میں سے شہد کی دو بڑی بوتلیں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ تم ایک نیک دل انسان ہو۔ اور مجھے یاد رہو گے۔ ممکن ہے چند ماہ بعد واپسی پر تم سے ملاقات ہو جائے۔ یہ کہہ کر اس نے اونٹ کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ اونٹ چل پڑا اور اس کے پیچھے رکا ہوا قافلہ بھی آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

خوشی اور نیکی کے عظیم فخر نے رات لمطوس کو سونے ہی نہ دیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ قریب کی مسجد میں جا کر اپنے نیک کام اور تاجر کے خلوص کا ذکر کرے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ باداموں اور شہد میں بہت سے ناپسندیدہ لوگوں کو بھی نیک بننے کا حصہ دینا پڑے گا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اپنے تاریک گودام میں جا کر پرانے برتنوں کے ڈھیروں سے پیالے ڈھونڈنے لگا اُسے کئی پیالے مل گئے۔ شمع کی مدھم روشنی میں اس نے دو پیالے منتخب کیے۔ انھیں اچھی طرح دھونے، چمکانے اور خشک کرنے کے بعد وہ چھت پر گیا۔ اس نے اپنے ٹوٹے اور سیاہ میز کو صاف کر کے اس پر دونوں پیالے ترتیب سے رکھے اور ہاتھ باندھ کر انھیں دیکھتے ہوئے گڑگڑایا۔ اے نیکی اور احسان کا بدلہ دینے والے رب، اب کی بار میں نے دو پیالے رکھ دیئے ہیں۔ کیونکہ میں نے اپنے پورے ہوش میں، پورے اخلاص کے ساتھ دو بڑی بڑی نیکیاں انجام دیں۔ مجھے اور نیکیوں کی توفیق کے لیے ان خالی پیالوں کو میرے لیے، برکت، خوشحالی اور خوش قسمتی کے لیے بھر دے۔ میرے لیے ان دو پیالوں کو دیکھ کر مجھ پر کوئی معجزہ ایسا نازل کر کہ میں غربت، تنہائی اور حسرتوں کی اذیتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات پاؤں، رات بہت دیر تک لمطوس اپنی دعائیں دہراتا رہا۔ کھڑے کھڑے تھک گیا۔ تو اس نے اپنے چہرے پر دونوں اس طرح پھرے جیسے سامنے کھڑی ہوئی نخوستوں کو ڈرا رہا ہو۔ رات دیر تک منا جاتوں کی وجہ سے وہ صبح دیر تک سویا رہتا۔

اور اٹھنے کے بعد وہ چہرے پر پانی کے دو چھینٹے مارنے کے بعد وہ اسی طرح گیلے ہاتھوں اور بھیگے چہرہ لیے قریب کے چھوٹے سے ہوٹل میں جا کر دودھ اور نان سے ناشتہ کرتا۔ اپنی نیک نامی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ اگر چہ اب وہ کسی حد محتاط بھی ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کے نئے کاروبار کو کامیاب ہوتا دیکھ کر دو ایک لوگوں نے بھی اس کی طرح کا دھندہ شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک تو وہ نانبائی تھا۔ جسے وہ اپنے نفع کے قصے سنا کر اُس نے اپنے کاروبار کی طرف راغب کر لیا تھا۔ اور اب وہ اُسے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ کیونکہ لمطوس کے مقابلے میں اس نے نانبائی کا کام چھوڑ کر اپنے بڑے بیٹے کو اپنی جگہ بٹھا کر وہ نچلے جھاڑ کر لمطوس سے پہلے بستیوں اور گلیوں میں پہنچ کر سامان اکٹھا کرنے لگا تھا۔

ایک صبح لمطوس کے لیے بہت ہی مہلک اور منحوس ثابت ہوئی تھی۔ جب وہ نانبائی اپنے بیٹے کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ تو نانبائی دھمکاتے ہوئے بولا، لمطوس گھروں سے پرانی چیزیں اور قیمتی برتن لیتے وقت احتیاط کیا کرو حویلیوں والے علاقے سے بادشاہ کے پرانے طبیب کے گھر سے چند ماہ پہلے ایک چاندی کا قیمتی پیالہ چوری ہو چکا ہے۔ جس کے کنارے پر سونے کا پترا سجا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے چاندی بھی بہت خالص اور سونا بھی بہت اصلی تھا۔ بادشاہ نے بطور خاص طبیب کو تحفے میں دیا تھا۔ اس پیالے کی چوری کے شبے میں طبیب نے اپنی دو کنیزوں اور ایک بوڑھے خادم کو بادشاہ کے قید خانے میں بند کروا دیا ہے۔ اب جانے ان کی جان کب تک چھوٹے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نے وہ پیالہ تمہارے آگے سستا بیچ دیا ہو۔ اس کی قیمت کوئی سمجھدار آدمی ہی لگا سکتا ہے۔ یہ باتیں سن کر لمطوس کے منہ کا ذائقہ ایک کڑوا سا ہو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ حویلیوں والے علاقے سے وہ چند دن پہلے کئی پیالے خرید چکا تھا۔ اور یہ پیالے کنیزیوں اور خادموں کے ہاتھوں سے ہی وہ خریدتا رہا۔ مالکوں کے ظلم اور بے بسی کے احتجاج میں گھروں کی چیزیں چوری کر کے بیچ دینے میں انھیں بے حد تسکین ملتی تھی لمطوس نے اپنی زندگی اور جسم کی ساری توانائی اکٹھی کر کے خود کو سنبھالے رکھا۔ اس نے نانبائی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ لیکن اُسے اپنے کانوں میں سیٹیاں سنائی دینے لگی تھیں اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ میں قیمتی چیزیں خریدنے کی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ میں ہمیشہ بے کار اور پرانی چیزیں خریدتا آیا ہوں۔ تم اپنے بارے میں سوچو کیونکہ تمہیں دولت کی ہوس چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اپنے مکان میں لوٹ کر لمطوس کو یوں لگا جیسے وہ

بہت بڑی دولت سے محروم ہو چکا ہے۔ اُسے اپنی گردن میں شدید تکلیف محسوس ہونے لگی۔ اُسے اپنے اندر بے حد کمزوری اور غربت کے احساس نے بخار میں مبتلا کر دیا۔ اونٹ پر بیٹھے ہوئے تاجر کی باتیں اور اس کی حرکات اس کے ذہن میں بار بار ابھرنے لگیں۔ تاجر کا پیالے کو انگلی سے بجا کر دیکھنا۔ اور تھیلے کے منہ کھول کر اُسے بھر بھر مٹھیاں بادام اور شہد کی بوتلیں دینا۔ اُسے بار بار یاد آتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ یقیناً یہ وہی پیالہ تھا جسے میں اپنی غفلت کی وجہ سے گنوا بیٹھا۔ وہ خود کو کوسنے لگا۔ اس پیالے کی قیمت میں کم از کم پانچ اونٹ تو خریدے ہی جا سکتے تھے۔ وہ سسکنے لگا۔ وہ تاجر کس قدر چالاک مکار اور تجربہ کار تھا، کس طرح یکدم اس نے پیالہ پہچان لیا۔ میرے پاس وہی پیالہ پرانے کاٹھ کباڑ میں پڑا رہا۔ میں اُسے خدا کے حضور سجا کر قسمت بدلنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ لیکن مجھے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو پایا۔ اونٹوں کا قافلہ ایک ماہ بعد واپس آئے گا۔ اس وقت تک میں کیسے جیوں گا۔ دُکھ پچھتاوے اور تاجر پر شدید غصے کی وجہ سے وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا بے بس ہوا کہ اس دن وہ پھیری کے لیے بھی نہ جا سکا۔ وہ سارا دن دکھ اور لٹ جانے کی خلش میں قالین پر کروٹیں بدلتا رہا۔ شام ہوگئی۔ اور اُسے پتہ ہی نہ چلا رات تک وہ

بے بس پڑا رہا۔ گذرتے وقت کے لمحوں میں اس کی اذیت بڑھنے لگی۔ کوئی نہیں جو میرا حوصلہ بڑھائے۔ مجھے تسلی اور اطمینان دینے والا کوئی نہیں۔ وہ خود سے بولتے بولتے رو پڑا۔ میرا کوئی نہیں۔ میں کتنا بے بس ہو بے نصیب ہوں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر کانوں میں بہنے لگے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ مدتوں وہیں پڑا رہے گا، بھوک پیاس کا احساس اُس کے اندر سے مٹ چکا تھا۔ وہ بے بسی سے اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھے اندھیرے میں چھت کو گھورتا رہا۔ اے خدا تو نے یہ سارا تماشا دیکھا اور مجھ پر مہربان نہ ہو سکا، اس کی آواز کمرے میں گونج اٹھی خدا کے نام کا اُس کی زبان پر آنا تھا کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا دل، دماغ اور جسم میں چھت پر جا کر خالی پیالوں کے سامنے کھڑے ہو کر دعائیں مانگنے کے لیے طاقت پیدا ہوگئی۔ یوں جست لگا کر اُٹھا جیسے چھت پر کوئی اس کا منتظر ہے۔ وہ اندھیرے میں گرتا پڑتا چھت پر جا پہنچا۔ اس نے محبت اور احترام سے پیالے کو چھو کر کہا، اے خدا۔ میرے تماشہ دیکھنے والے۔ تو جانتا ہے کہ میں دو نیکیاں کرنے کے بعد بھی ابھی تک میز پر پڑے ہوئے ان دو پیالوں کی طرح محروم ہوں۔ یہ پیالے کبھی غذاؤں سے بھرے بھی ہوں گے۔ لیکن اب بالکل میری طرح خالی ہیں۔ یہ پیالے

تجھے میری مفلسی، غربت اور خسارے کی گواہی دے رہے ہیں۔ اے رب رزق اور بدلہ دینے والے۔ میں لٹ جانے کے بعد کیا مفلس ولاچار ہی رہوں گا۔ میرے خالی پیالوں کو میرے لیے برکت اور دولت سے بھر دے میرے کھوئے ہوئے خزانے کا نقصان کسی بڑے نفع میں مجھے لوٹا میرے خالق۔

بدلے ہوئے موسم کی گرمی کی وجہ سے لسطوس وہیں چھت پر لیٹ گیا وہ سونے کی کوشش میں تاروں بھرے آسمان کو گھورتا رہا اور اُس کی آنکھ لگی۔ صبح سورج کی گرم کرنوں کی چبھن محسوس کرکے اُس کی آنکھ کھلی۔ وہ حسب عادت منہ گیلا کرکے نانبائی کی دُکان پر گیا۔ دُکان پہ اُس کے بیٹے کو تنہا دیکھ کر اُسے بہت اچھا لگا۔ ناشتہ کرتے وقت اُس کا دل ادھیڑ عمر نانبائی کے لیے موت کی دُعائیں مانگتا رہا۔ لیکن اپنی مایوسی اور محرومی کی وجہ سے اس کا ذہن نانبائی کے لیے موت کی کوئی سبب سوچنے میں ناکام رہا۔ اس کا دل کاروبار کرنے سے اُٹھ گیا۔ کئی دن تک وہ ناشتہ کرنے کے بعد اپنے گھر میں چھپ کے بیٹھ جاتا اور اونٹوں کے قافلے کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہتا۔ اس کے کان قافلے کی گھنٹیوں کے لیے ترسنے لگے۔ اپنے پاس جمع پونجی سے کسی حد تک وہ مطمئن تھا۔ لیکن اسکی بھوک، پیاس اور نیند اُڑ چکی تھی۔ اس کے جان پہچان والوں نے اس کی صحت دیکھ کر سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے پرانے گاہک اُسے نانبائی کی دُکان پر دیکھ جاتے تو اُسے پھیری نہ لگانے کی وجہ پوچھتے۔ تو وہ اپنی بیماری کا کہہ کر انہیں مطمئن کر دیتا۔ اندر سے وہ جانتا تھا کہ ایک طرف تو قیمتی پیالے کو ہاتھ سے گنوانے کا دُکھ اور دوسری طرف شاہی طبیب کے گھر سے چوری ہونے والے پیالوں نے اُس کی ہمت ختم کر دی تھی۔

رفتہ رفتہ اُس نے کاروبار بند کر دیا اُسے دن رات اونٹوں کے قافلے اور اس چالاک تاجر کی واپسی کا انتظار رہنے لگا۔ سُستی اور مایوسی نے اُسے دُبلا پتلا اور کمزور کر دیا تھا۔ اُس کی تھوڑی کی ہڈی نیچے کی طرف لٹک گئی تھی چہرے سکڑ کے جھریوں سے بھر گیا تھا اُس کی چال بھی بدل گئی تھی پاؤں میں زمین پر جم کر اُٹھنے کی طاقت کم ہو چکی تھی۔ اب اُسے اپنے مکان کے اندر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر دُعائیں مانگنا بہت مشکل اور تکلیف دہ لگتا تھا۔ لیکن دُعائیں مانگے بغیر اُس کے دل کو سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ گرمی کے موسم کی شدت اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رات مشکل سے چھت پر چڑھتا اور اُترتے وقت اس کے پاؤں کانپنے لگتے اور سر چکرانے لگتا۔

ایک صبح سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے اس کے کانوں سے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز ٹکرائی۔ پہلے تو وہ اسے اپنا خواب سمجھا۔

سورج کہیں اور پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا لیکن صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے گھنٹیوں کی آواز سننے لگا۔ یقین کرنے کے بعد وہ للکارتے ہوئے اُٹھا۔ سیڑھیوں سے پہلے اس نے تاجر کو بہت سی دھمکیاں اور گالیاں دے ڈالیں۔ پھر غصے اور عجلت میں اس کے پاؤں زینے پہ ٹکنے کے بجائے ہوا میں ہی کہیں معلق ہو گیا۔ اس کا سر کئی بار دیوار سے ٹکرایا۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے دروازے سے جا ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی آہ نکلی اور اُس کی دونوں ٹانگیں جو کہ آخری زینے پہ پڑی تھیں۔ بے جان اور ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور اس کا چہرہ دروازے کی نچلی چوکھٹ پہ جا کر اٹک گیا اور اس کا منہ زمین پر کھلا ہوا پڑا تھا۔ اونٹوں کے قافلوں کی گھنٹیاں بجتی جا رہی تھیں۔ صبح اُٹھنے والے بچے اور لڑکے اونٹوں کے ساتھ خوش ہو کر دوڑے جا رہے تھے یکا یک ایک اونٹ لسطوس کے دروازے کے سامنے رُکا۔ سرخ و سفید اور موٹا تازہ آدمی اونٹ سے نیچے اُتر کر اس کے دروازے پر دستک دینے لگا بہت دیر تک دستک دینے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ تاجر نے بے دلی سے گردن ہلائی اور اونٹ پر سوار ہو کر اُسے آگے بڑھنے کے لیے اُس کی گردن پہ ہلکی سی جست لگائی اس کے پیچھے اونٹوں کی قطار چلے جا رہی تھی۔ بازار کے قریب سے گزرتے ہوئے تاجر نے ایک راہگیر سے پوچھا، سورج چڑھ رہا ہے لیکن تمہارے شہر کے بازار نہیں کھلے۔ کیا یہ سب دُکانیں جلتی دوپہر میں کھلیں گی۔ راہگیر نے ہنستے ہوئے کہا نہیں عزیز دو دن سے شاہی طبیب کے ہاں بہت بڑی دعوت ہے اس نے پورے شہر کو ضیافت پہ بلایا ہے تم بھی رُکو۔ اور کچھ کھا کے آگے جانا۔ پورے شہر کی ضیافت؟ کیا کوئی حاتم طائی پھر پیدا ہو گیا ہے، تاجر اونٹ پہ ہچکولے کھاتے ہوئے بولا۔ ہاں یہ بات بڑے مزے کی ہے۔ راہگیر دوستانہ انداز میں بولا، شاہی طبیب اگرچہ بادشاہ کی خدمت کرنے سے سبکدوش ہو چکا ہے وہ بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اُس کا رعب اور مال بادشاہ سے تھوڑا ہی کم ہے۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنی دو کنیزوں اور ایک غلام کو ایک قیمتی پیالے کی چوری کے الزام میں قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن پھر وہ پیالہ اس کے گھر کے نعمت خانے سے برآمد ہو گیا۔ اپنی اس زیادتی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے شاہی طبیب نے دونوں کنیزوں کو اپنے نکاح میں لے لیا ہے اور غلام کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نکاح کی خوشی میں شاہی طبیب نے ضیافت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ کل کا دن بادشاہ سلامت اور ملک کے اہم لوگوں کے لیے تھا۔ آج عام لوگوں کے لیے ہے سنا ہے یہ اہتمام تین دن تک مسلسل جاری رہے گا۔

☆☆☆☆☆

ارتقاء

آج کافی دنوں بعد اپنی اپ لوڈ کی ہوئی تازہ تصویر خود بھی دیکھی میرے خدوخال میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ عمر کے اس حصے میں بھی چہرے کی رعنائی اور بدن کی چستی آج بھی نوجوانی والی چمک دمک کے قریب ہی نظر آئی، زندگی کے پانچ سو سال گزر جانے پر بھی گزرا ہوا لمحہ لمحہ جیسے آنکھوں کے سامنے ہی ہو - مجھے سب واقعات ایسے یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔ میں ایک پُرتجسس انسان ہوں اور یہی تجسس مجھ کو مزید راہیں تلاشنے پر اکساتا رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم ترقی کے جن زینوں پر قدم رکھ چکے ہیں آج سے چار ہزار سال پہلے کا انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جس سائنس اور تحقیق کا عمل چیزوں کی حقیقت اور طاقت کا اندازہ لگانے میں کئی کئی سال عرق ریزی میں لگا رہتا تھا۔ زندگی کا دورانیہ بہت محدود تھا، ترقی کی رفتار فطری بلوغت سے کئی گنا تیز ہونے کے باوجود اتنی آہستہ تھی کہ انسان اپنی بے اختیاری اور کم عمری کی الجھنوں میں ہی بھٹکتا رہتا تھا۔ اور پھر ایک روز ہمیں ڈارک میٹر پر دسترس حاصل ہوگئی، ہمیں انرجی کے اس سورس نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ تب عمریں کوتاہ نہیں رہیں وسائل بے تحاشا اور آسان ہوگئے ضروریات اتنی سہل ہوگئیں کہ خواہش پر میسر ہونے لگیں لیکن رفتار اور فاصلہ اب بھی ہمارا بڑا مسئلہ تھا لیکن پھر وقت نے وہ دن بھی دیکھا جب رفتار اور فاصلے پر انسان نے اختیار حاصل کرلیا اور وہ تجربات کا ہاتھ تھامے جسمانی طور پر اپنے نظام شمسی سے باہر نکل کر دیکھنے کے قابل ہوگئے۔ اب فاصلے ہمارے لیے اہمیت نہیں رکھتے ہم پلک جھپکتے ایک زمین سے دوسری زمین کا سفر نہایت سہولت سے طے کر لیتے ہیں - انسانی دماغ کی صلاحیتوں کو اس قدر بڑھا دیا گیا ہے کہ انسان خود بھی اپنی ذہنی رسائی پر حیران ہے مگر ہم آج بھی انسانی دماغ کو مکمل نہیں پڑھ پائے۔ حالانکہ آج ہر عام انسان بھی

احمد سبحانی آکاش

اپنے دماغ کا چالیس سے پچاس فیصد استعمال میں رکھتا ہے۔ یعنی آج سے چار ہزار سال پہلے سے آج کا دماغ تیں گنا زیادہ کام کرتا ہے اور انسان اسے سمجھ بھی چکا ہے۔ اب ہم جب چاہیں تیسری ڈائمنشن سے نکل کر چوتھی پانچویں سے آٹھویں ڈائمنشن تک سروائیو کر لیتے ہیں۔ آج ہم اپنی کہکشاں کے ستر فیصد حصے پر اپنی اجارہ داری بنا چکے ہیں کئی نظام شمسی تلاش کر لیے گئے ہیں۔ کئی تشکیل پا چکے ہیں ابھی تشکیل کے عمل میں ہیں۔ ہم نے اپنے رہنے کے لیے نئی زمینیں تلاش کر کے ان پر انسانی آبادیاں بنا رکھی ہیں ہمارے سائنس دان اب دوسری کہکشاؤں پر تحقیق کے لیے مشن بھیج چکے ہیں۔ انرجی کے اتنے وسائل ہمارے پاس موجود ہیں کہ اگلے ہزاروں برس ہم صرف تحقیق پر ہی لگا دیں تب بھی وہ وسائل ختم نہ ہوں۔ ابھی تک ہم اس کائنات کا صرف پچیس فیصد ہی دیکھ پائے ہیں اب ہمارے پاس زمینوں کی کمی نہیں رہی اور نہ ہی خوراک کی۔ ہم نے جسمانی نشو ونما اور اس کی بیماریوں پر بھی مکمل حد کے قریب قابو پالیا ہے۔ وبائیں اب انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتیں اب بیماریوں اور وباؤں سے اس طرح اموات نہیں ہوتیں جیسے پہلے وقتوں میں ہوا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ہمارے تحقیق کا راس آٹھ نو سو سال کی زندگی پر بھی مطمئن نہیں ہیں وہ مزید بہتری کی خواہش میں منزلوں پہ منزلیں سر کیے جا رہے ہیں۔ آئے دن کوئی نئی تحقیق سامنے آتی ہے اور پچھلی تمام جستجو کے مقابل آ کھڑی ہوتی ہے۔ انرجی کے مزید نئے ذرائع ہاتھ آنے کی توقع میں ہم اپنے سفر کی حدود کو وسعت دیئے جا رہے ہیں۔ صرف اس امید پر کہ ایک روز ہم زندگی کا راز پالیں گے۔ یہ واحد ایسا معاملہ ہے جس کے سامنے انسان آج بھی بے اختیار اور بے بس ہے۔ یہی بے اختیاری انسانی تگ و دو کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ ان سب سہولتوں اور صلاحیتوں کے ہونے کے باوجود تخریب کا عمل ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ طاقتیں آج بھی ایک دوسرے پر برتری کے لیے کوشاں ہیں۔ انسان، جس کی بقا کے لیے ہزاروں سال سے اتنے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں اسے آج بھی اتنی بے رحمی سے مار دیا جاتا ہے بل کہ اب تو زمین کے کسی بھی خطے پر بسنے والے جانداروں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ تباہی کی ایسی ایسی صورتیں تیار کر لی گئی ہیں کہ اشارے کی دوری پر ہنستی بستی زمین آگ کا گولہ دکھائی دینے لگے۔ بڑی بڑی طاقتوں نے اپنی اجارہ داری کی حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔ کئی کئی تو نظام شمسی کے مالک گروپ آج بھی گفتگو انسان کی بقا اور بھلائی پر

کرتے ہیں اور سامان انسان کی فنا کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اس سب کے باوجود ہر انسان اپنے مرکز کے حکم کی تعمیل میں ہی زندگی گزارتا ہے اور مرکز اس کی سہولتوں اور آسائشوں کا خیال رکھتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان نے اتنا طویل سفر کس مقصد کے تحت کیا ہے بارہا سوچ بچار کے بعد صرف ایک ہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انسان اپنی موت پر قابو پانا چاہتا ہے خود کو ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ فنا دیکھنا چاہتا ہے۔ کیا انسان اپنے ارادے کی تکمیل کر پائے گا یا اس کا سارا سفر رائیگاں جائے گا۔ ادھر یہ سوچ اور ادھر اس ساری ترقی اور بربادی کے ساتھ ساتھ نسلِ انسانی کے اس قدر فروغ کے بعد بھی انسان اتنا تنہا ہو گیا ہے کہ وہ کئی کئی برس ایک ہی مقام پر گزار دیتا ہے۔ دلچسپیوں کے اتنے ذرائع میسر آ گئے ہیں کہ انسان کو اپنی ذات کے لیے بھی وقت نکالنا مشکل ہو چکا ہے اب ہمارے لمحے لمحے کی کیفیات ہماری انگلیوں کی پوروں اور ہمارے خیال کی دوری کے فاصلے پر موجود ہیں۔ ہم اب اپنے گزرے کل کو بھی مجسم دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا پل پل دیکھنا تو ایک طرف ہم مستقبل کے مشاہدات میں مصروف ہیں اتنی سہولیات اتنی آسائشوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان اندرونی اطمینان سے عاری ہے۔ نہ جانے کون سی کمی ہے جو اسے بے چین کیے رکھتی ہے۔ مجھے تو یہ کمی ہمیشہ فطرت کی طرح لگی ہے جسے ہمارے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ہمارا ہونا صرف زندگی گزارنا نہیں بل کہ اس کا کوئی خاص مقصد بھی ہے۔ ہم خود رو نہیں ہیں مکمل پلان کے تحت بنایا گیا ہے۔ کاش ہم اس مقصد کی تہہ تک پہنچ پائیں اور اپنے تعمیری عمل کو اپنے مقصد سے وابستہ کر سکیں تو شاید ہمیں وہ بھی مل جائے جس کے لیے بھٹک رہے ہیں ورنہ ایک لامتناہی سفر نادیدہ کائنات اور وقت اپنا کھیل کھیلتے رہیں گے۔ تب تک جب تک ہم اپنے اصل مقصد کی طرف لوٹ نہیں آتے جب تک ہم مادے کی ترقی کے ساتھ ساتھ روح کی بالیدگی کے لیے قدم نہیں اٹھاتے، جب تک ہم محبت کرنا نہیں سیکھ لیتے۔ یہ محبت ہی ہے جو مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے جو عمل کو حوصلہ بخشتی ہے جو اپنے مطلوب کی خاطر کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کاش ہم انسان کہلانے والے انسانیت آشنا ہو جائیں تو کیا خبر ہمارے سفر کا حاصل ہمارے مقدر میں لکھ دیا جائے۔ انھی خیالوں میں مگن تھا کہ روبوٹک وین مجھے وارننگ دینے لگی اور میری مصروفیات کا چارٹ میرے سامنے معلق ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

تھکن کا سفر

اسی وقت بارش تو رُک گئی تھی مگر ہوا میں نمی کی وجہ سے ہلکی سی خنکی ایک لطف دے رہی تھی اس لیے میں پیدل ہی اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ بازار سے ذرا آگے دائیں طرف کو مڑتے ہی سڑک کے ایک طرف تو نئی آبادی تھی مگر دوسری جانب سڑک سے بہت نیچے کھیت تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ پستی بھی ایک دن بلند ہو کر اچانک ایک جدید بستی کا روپ دھارے لگے گی کہ شہر میں اب تو جس راستے پر دو ایک سال بعد جانا ہو تو وہاں کا جغرافیہ ہی تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ ابھی میں خود سے اس موضوع پر کچھ اور بات کرنا چاہتا تھا کہ میرے کاندھوں پر ایک زوردار ہاتھ پڑا۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب بڑے دنوں بعد دیکھا ہے'' میں نے مڑ کر دیکھا تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ایک نوجوان مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے میں نے اُس سے ہاتھ ملایا مگر وہ میرے لیے قطعاً اجنبی تھا لمبا ساقد، چہرے پر چھوٹے بڑے بے شمار سرخی مائل دانے، کلین شیو جو شاید ابھی ابھی کیا تھا کہ بعض دانوں سے خون اور پیپ نکل رہی تھی۔ خوبصورت سبز آنکھوں میں بہت سا سرمہ جو ذرا ذرا سا گالوں پر بھی بہا ہوا تھا۔ گلے میں کئی ایک سفید کالے دھاگے اور تعویز میں نے ذرا سا دبا کر ہاتھ چھڑانا چاہا مگر اس نے پوری قوت سے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ گرم جوشی سے ہاتھ ملانے والے لوگ بہت پُرخلوص ہوتے ہیں مگر مجھے اس اجنبی نوجوان کا یہ، خلوص مہنگا پڑ رہا تھا جس کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ تھی

ناصر علی سیّد

مگر آنکھوں میں بے نام سا کرب بھی دکھ رہا تھا۔ اُس نے اچانک میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب تم ڈاکٹر ہو اور میں ایک بس کنڈیکٹر'' مجھے معلوم ہے تم مجھے نہیں جانتے ہو لیکن میں تمھیں جانتا ہوں تم ڈاکٹر ہو بڑے آدمی ہو۔ پتہ ہے بڑے لوگوں کو بہت لوگ جانتے ہیں اس لیے وہ لوگوں کو جاننے کے لیے پریشان نہیں ہوتے۔ تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر ہوں میں گاڑی چلاتا ہوں تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں۔ میں اُسی سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے بولنے کا موقع دیتا ہی نہیں اچانک وہ بائیں طرف بنے ہوئے ایک گھر کے قریب ایک ریڑھی والے کے پاس دوڑ کر گیا اور اس سے ہاتھ ملانا چاہا مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو یہ دوڑ کر واپس ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا اور میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر مگر یہ دنیا ساری پاگل ہے تم کو یاد ہے میں ایک دن ہسپتال تمھارے پاس آیا اور تم نے میرے ہاتھ پر پٹی باندھی تھی مگر میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ دیکھو نا یہ شریفو جب مجھے چائے دیتا ہے تو اس میں دودھ بالکل نہیں ڈالتا کہتا ہے تم نے کالی چائے مانگی ہے دودھ سے خراب ہو جائے گی پورا پاگل ہے۔ دودھ والی چائے کو کالی چائے بھی کہنے نہیں دیتا۔ سچی پاگل ہے اور پتہ ہے یہ دنیا ساری پاگل ہے تم ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر میں اپنی وفا کو دنیا سے دور رکھتا ہوں تم بھی دنیا سے فاصلے پر رہو گے تو میری طرح خوش رہو گے فاصلہ اچھا ہوتا ہے یہ کہہ کر وہ گھر گھر کر کے جیسے بس کو سٹارٹ کر کے ہوا میں سٹیرنگ گھماتا ہوا مجھ سے آگے نکل گیا مگر جلد ہی ایک لمبی سی ''چی'' کی آواز منہ سے نکال کر وہ رکا ہوا میں ریورس گیئر لگایا اور اُلٹے قدموں میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر آؤ بیٹھو میں تم سے کوئی کرایہ نہیں لوں گا۔

تم نے میری پٹی کی تھی یاد ہے نا؟ تمھیں بتاؤ نا۔

آؤ جلدی کرو بیٹھو۔

میں نے آہستہ سے کہا کنڈیکٹر کا کام بس چلانا نہیں ہوتا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے کانوں میں سرگوشی کی گاڑیاں کنڈیکٹر ہی چلاتے ہیں..... ڈرائیور تو سواریوں سے پیسے لیتے ہیں تم ڈاکٹر میں بس کنڈیٹر۔ شریفو پاگل ہے چائے میں مجھے دودھ ڈال کر نہیں دیتا۔ کالی چائے اور میں دودھ ڈالتے ہیں نا لوگ۔ تم تو ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر میں اُسے کہنا چاہتا ہوں کہ تم کچھ بھی سہی کوئی بھی سہی مگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ میں تو ایک کہانی کار ہوں مگر میں اُسے نہیں کہہ سکتا مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں

گفتگو کے لیے اس نے جو ایک واسطہ تلاش کیا ہے اس کے ٹوٹنے سے اس کا دل نہ ٹوٹ جائے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں سڑک کے دائیں طرف ٹریفک کی حفاظت کے لیے جو چھوٹی چھوٹی دیواریں وقفے وقفے سے بنائی گئی ہیں وہ ان پر چڑھ جاتا ہے۔ دوڑتا ہے ڈاکٹر صاحب تم بھی اوپر آ جاؤ۔ سڑک پر پانی اور کیچڑ ہے کہیں تمھارے کپڑے خراب نہ ہو جائیں اور تم نے پتلون پہن کر رکھی ہے اس پر تو چار من صابن خرچ ہوتا ہے۔ صابن بہت مہنگا ہو گیا ہے تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر تمھارے کپڑے خراب نہیں ہونے چاہئیں ورنہ لوگ پھر تمھیں پاگل کہیں گے دنیا سے دور رہو یہ دنیا پگل ہے شریفو بھی پاگل ہے چائے میں دودھ نہیں ڈالتا تم نے میری پٹی کی تھی۔ پٹی پر بھی صابن خرچ ہوتا ہے لوگ روزانہ میری بس کو خراب کر دیتے ہیں میں روز اسے دھوتا ہوں مگر میرے پاس صابن نہیں ہوتا تم تو ڈاکٹر ہو تم مجھے سو من صابن لے کر دے دو نا۔ میں اس دنیا کو دھونا چاہتا ہوں میں شریفو کو دھونا چاہتا ہوں۔ میں کالی چائے کو دھو کر سفید کرنا چاہتا ہوں اب وہ دیوار سے اتر آیا مجھے آگے بائیں طرف مڑنا تھا دائیں طرف اب وہ پستی ختم ہو گئی تھی اور قبرستان شروع ہو گیا تھا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا تم ڈاکٹر ہو میں بس کنڈیکٹر یہ دیکھ رہے ہو نا؟ اس نے قبروں کی طرف اشارہ کیا یہ سب لوگ تھک گئے ہیں آرام کر رہے ہیں جو بھی زندگی سے تھک جاتا ہے یہاں آرام کرنے آ جاتا ہے۔ یہ ہمیں دیکھ رہے ہیں ہماری باتیں سن رہے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ تھکے ہوئے ہیں نا۔ تم ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر آخر ہم دنیا سے کیوں نہیں تھکتے ہم پاگل ہیں نا؟ ہم تھکنا بھول گئے ہیں ہم سب دوڑ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، اس نے پھر ہوا میں گیئر بدلا تو میں نے اسے پکڑ لیا تم نے نام تو بتایا نہیں دوست؟ وہ ہنسا۔ دوست؟ نام؟

تم ڈاکٹر ہو اور میں بس کنڈیکٹر وہ ہنسا اور پھر زور سے ایک قہقہہ لگایا ارے میں تو ابھی تک تمھیں ڈاکٹر سمجھ رہا تھا تم تو پاگل ہو نرے پاگل اب اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا وہ ہنستا رہا ہنستا رہا اور ہاتھوں سے میری طرف عجیب عجیب اشارے بھی کرنے لگا شاید اتنی دیر کی طویل اور سنجیدہ گفتگو سے اس کا کتھارسس مکمل ہو چکا تھا پھر وہ دوڑ پڑا زور زور سے ہنستا ہوا قہقہے لگاتا ہوا سٹیرنگ تھماتا ہوا تھکے ہوئے لوگوں کے کچے پکے پیڈ بریکروں پر زندگی کی وہ گاڑی دوڑانے لگا، جس کا وہ کنڈیکٹر بھی تھا اور ڈرائیور بھی۔

☆☆☆☆☆

قاتل

جن لوگوں کے پاس آپ کو دینے کے لیے وقت ہی نہ ہو اُن کے پیچھے پیچھے اپنی محبت کا رونا روتے پھرنا بے معنی ہے۔ کیونکہ بھیک میں ملے دو لمحوں کی توجہ کا اگر دل ایک بار عادی ہو جائے تو ساری زندگی یہی بھیک ہی ملتی رہتی ہے۔ اور وہ تو بھیک مانگنے تک آ گئی تھی۔ ستم ظریفی یہ کہ اُسے بھیک بھی نہ دی گئی۔ توجہ کی اِک بھکارن کو کس بے دردی سے دھتکار دیا گیا تھا۔ زندگی اُس کے لیے بے معنی ہو گئی تھی۔ بھلا محبت کے بغیر کون سی زندگی ہوتی ہے۔

عجیب شخص تھا وہ اُس کے بارے میں کچھ غلط سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔۔ مر سکتی تھی بس۔ دریا کنارے کی ریت پر پڑے ایک پتھر پر پاؤں ٹکائے ہوئے کبھی کبھی لہریں آ کر اُس کے مرمریں پاؤں کو چوم جاتیں تھیں۔ پاؤں میں ریت چبھتی تو گدگدی محسوس ہوتی۔ صبح ہی وہ کالج کا بہانہ کر کے شہر کے قریب بہتے شاندار دریا کے کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر آ بیٹھی تھی۔ یہ کنارا بند کے ساتھ اِک کٹاؤ کی اوٹ میں تھا اور یہاں سے فوراً دیکھ لئے جانے کا اِمکان کم ہوتا تھا۔ اُسے تنہائی، ویرانی، اکیلا پن اور دُور تک ہُو کا عالم اچھا لگنے لگا تھا۔ گھنٹوں خود کو اور اُس کو سوچتے رہنا۔ خود کلامی اِک انجانی خوشی اور مسرت میں ڈوبے رہنا۔ مگر آج سب کچھ فرق تھا کسی دُھند کے غبار میں لپٹا ہوا۔ جیسے چاروں طرف کُہرے کی چادر ہو۔ آنسوؤں کے غبار میں ڈوبتی اُبھرتی، وہ کتنی ہی دیر سے یہاں بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور یہ اُس کا آخری میسج تھا کہ دریا کنارے ملنے آؤ۔ میں منتظر ہوں۔ وہ کئی گھنٹوں تک اُس کا انتظار کرتی رہی نہ وہ آیا نہ اُس کا پیغام آیا۔ اُس نے کبھی آنا ہی نہیں تھا۔

بھلا لاحاصل لمحے وصولنے کا کوئی فائدہ ہے۔ ہوائیں اپنی رفتار سے چلتی رہیں۔ وہ تنہا اُداسیوں کے تاریک سائے میں بیٹھی لہریں گنتی رہی۔ یہ کام اچھا ہے۔ وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مگر جب آنکھوں میں دُھواں بھرا ہو تو بندہ کیا کر لے

آسناتھ کنول

گا۔ خود کلامی کے سوا اُس کے پاس کیا رہ گیا تھا۔ وہ خود سے ہی مخاطب تھی۔

سُنو شیریں۔ اب تم اپنی حیثیت کھو چکی ہو۔ اُس کی نظروں سے گر کر دوبارہ اُٹھنا چاہتی ہو۔ گرے ہوئے اشکوں کو پلکوں سے نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ تم ایک گرا ہوا آنسو ہو، جو دامن میں نہیں مٹی میں مل جاتا ہے۔ وہ دل کے ناقابل بیان درد سے گزرنے لگی۔ کلیجہ جیسے کٹ رہا تھا۔ شیریں کو اپنی حیثیت بہت کمتر محسوس ہوئی۔ دل ہی دل میں وہ سُلگ اُٹھی۔ وہ اس شخص کی آواز سُننے کا انتظار کرتی رہی۔ میسج کرتی تو کوئی جواب نہ آتا۔ واٹس ایپ دیکھتی وہ میسج پڑھ لیتا تھا۔ مگر جواب نہیں دیتا تھا۔ کیسا تعلق تھا۔ کیسی محبت تھی۔

اُسے یاد تھا۔ ٹھیک چھ مہینے پہلے وہ شام۔ ہلکی ہلکی سردی اُترنی شروع ہو چکی تھی۔ اب شام کو ہلکی سی خنکی ہو جاتی۔ اکتوبر کی ایک شام، وہ ٹی وی کے آگے بیٹھی کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ جب قریب پڑے فون پر کوئی نیا نمبر جگمگانے لگا۔ اُس نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف اک گمبھیر سی خوبصورت مردانہ آواز تھی۔ حال پوچھا گیا۔ تعارف ہوا۔ تو وہ پہچان گئی۔ اُس نے مدتوں پہلے کہیں دیکھا تھا۔ اُس کے نام اور کام سے بھی واقف تھی۔

مصروفیات زمانہ میں کھو کر وہ یکسر بھول چکی تھی کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اتنی مدت بعد اچانک ہی کسی کا اِس طرح یاد کرنا اُسے حیران کر گیا۔ وہ بہت خوش بھی ہو گئی۔ کتنی مدت بعد بھی کسی نے اُسے یاد رکھا تھا۔ وہ جیسے کسی ہوا کے جھونکے کی طرح اُس کی زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ جیسے اُسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ بہت مسرور ہوئی۔ اُسے یاد آیا کہ وہ کیسا سمارٹ اور شاندار آدمی تھا، جب اُس نے اُسے دیکھا تھا تو وہ ایک مقبول فگر تھا تب بھی اچھا لگا تھا۔ اب تعارف کروا کر تو جیسے سید عادل میں اُتر گیا۔ ہر دوسرے دن اُس کا فون آ جاتا۔ اور وہ گھنٹوں باتیں کرتی۔ دونوں ہی باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔ وہ خود اپنی ذات کی تنہائی اور خود کلامی میں گم رہتی۔ اب تو جیسے نیا سبجیکٹ ہاتھ آ گیا تھا۔ دل پسند موضوع، فنی باتیں، اشعار، چٹکی کاٹتے ہوئے جملے اُسے زندگی دینے لگے۔ وہ خوش رہنے لگی۔ وہ اُس کے دل و دماغ کے کسی خانے میں فٹ ہو گیا تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا اُس سے باتیں کرتے کرتے کب وہ اُس کے لفظوں کے حصار میں قید ہو گئی۔ مدتوں پہلے دیکھے ہوئے اِس شخص کے ہیولے سے باتیں کرنے لگی۔ وہ محبت میں مبتلا ہو چکی تھی اور دن بدن وہ اُس کی محبت میں گہری ہوتی چلی گئی۔

پاگل عورت اُسے مسیحا سمجھنے لگی تھی۔ وہ اُس کی اُداسیوں میں ہنسی بکھیرنے لگا تھا۔ اکثر کئی جملے کئی لفظ ادا کر جاتا کہ وہ گھنٹوں اُنہیں سوچتی رہتی۔ اپنے آپ مُسکراتی

رہتی - اپنے ہی آپ سے باتیں کرتی - اُلجھتی، روٹھتی، مناتی - خوابوں خیالوں کے لمبے سفر پر اُس کے ساتھ نکل جاتی - بند آنکھوں میں اُس کی تصویر سجائے اُس کے پیکرِ خیال سے باتیں کرتی رہتی - وہ جان گیا تھا کہ شیریں اُسے چاہنے لگی ہے - مگر اُس نے اُسے روکا نہیں - وہ آگے ہی آگے بڑھتی رہی - بات عشق اور پرستش کی حدوں کو چھونے لگی - مسئلہ کافی بڑھ گیا تھا - وہ پور پور اُس کی محبت میں ڈوب گئی تھی - مدتوں پہلے دیکھے ہوئے اِک سمارٹ اور ڈیشنگ آدمی کو جو بہت شاندار گفتگو کرتا تھا - وقت بدلا تو اُس میں بھی یکدم کوئی تبدیلی آ گئی - اب وہ اظہار کرتی تو وہ آگے سے ٹال مٹول کرتا - وہ چونکہ عمر میں اُس سے کافی بڑا تھا - عمروں کے فرق نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا دیا تھا - گھنٹوں باتیں کرنے والے کتنے بزدل تھے - وہ جس نے اُسے اپنی باتوں، لفظوں، حرفوں، جملوں کا اسیر کر لیا تھا - اب پیچھے ہٹنا شروع ہو گیا - شروع شروع میں وہ ہر دوسرے تیسرے دن فون کر لیتا - شیریں فون کرتی تو فوراً اُٹھا بھی لیتا - بات تو وہ بھی کرنا چاہتا تھا مگر اپنی مرضی اور پسند سے - اُس کے اندر کوئی تیزی نہیں تھی - رفتہ رفتہ وہ خفا رہنے لگی - آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ اب آپ توجہ نہیں دیتے - وہ اکثر گلہ کرتی -

اوہ نہیں - ایسی کوئی بات نہیں - بس مصروفیات - اندر باہر آنا جانا - وہ بہانہ بناتا - میں جانتی ہوں پہلے آپ کے پاس وقت ہوتا تھا - اب نہیں - میں کب آپ کی زندگی میں حائل ہو رہی ہوں - نہ یہ کہا کہ مجھ سے شادی کر لیں - مجھے تو آپ کا تھوڑا سا وقت اور تھوڑی سی توجہ چاہیے - وہ روہانسی ہو جاتی - بات کر لیا کریں کبھی - میں جینے لگ جاتی ہوں - اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے - وہ تھوڑا سا پسیج گیا - کرتا ہوں ناں وہ بڑی محبت سے کہتا - وہ سب کچھ بھول کر لاکھ جان سے قربان ہو جاتی - ویسے ایک بات تو سچ ہے آپ قریب آنے کے بجائے دور جا رہے ہیں - میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں - جب کہ آپ نہیں چاہتے -

مجھ سے مل کر کیا کرو گی - وہ کہتا - اپنی محبت کو دیکھنا، ملنا اور چھونا چاہتی ہوں - آپ کا ہاتھ تھام کر اپنا سر آپ کے کندھے پر ٹکا کر اپنے دُکھ سُکھ کا شریک بنانا چاہتی ہوں - جاننا چاہتی ہوں - مدتوں پہلے دیکھا ہوا ایک شاندار آدمی اب کیسا ہے - اُس نے جلدی سے کہا - جی نہیں - آپ ایسے کہہ کر میری محبت کو کم نہیں کر سکتے - وہ اُسے سمجھانا چاہتا تھا مگر کیسے؟ اُسے سمجھانا بھی نہیں آیا - میری بات سُنو - جب تم نے مجھے دیکھا تھا - تم چھوٹی تھیں - بیچ میں تیس سال کا وقفہ پڑا - میں پینتیس سال نوکری کر کے ریٹائر ہو چکا ہوں - اب بیمار بھی رہتا ہوں - کوئی رنگ روپ نہیں - تمہیں مایوسی ہو گی - دوبارہ پلٹ کر مجھے دیکھو گی بھی نہیں اور تم جوان

ہو- خوبصورت بھی ہو- مجھ سے ملو گی تو دیکھ کر منہ پھیر لو گی- بہتر ہے ضد چھوڑ دو-

آپ جیسے بھی ہیں- مجھے پسند ہیں- وہ ضدی لہجے میں بولی- وہ جواباً غصے میں آ گئی- میرا اتنا بھی حق نہیں- میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں- آپ میرے جذبات سے واقف ہو چکے ہیں- میں بھی کچھ کچھ جاننے لگی ہوں- بے شک پوری طرح نہیں- لازمی بات ہے آپ کی سوچ، آپ کے فہم وادراک تک پہنچنا میرے لئے ممکن نہیں- صرف ایک محبت جو پارکوں، باغوں، ہوٹلوں یا تنہا کمرے کی محتاج نہیں- یہ آپ بھی جانتے ہیں- میری محبت جسم کا حصول نہیں ہے- دل اور روح میں حصہ دار بننا چاہتی ہوں- آپ سے کسی بھی طرح کا مطلب یا لالچ نہیں- صرف ادبی، ذہنی، فکری، آبیاری کی خواہش ہے- آپ اچھے لگے- کیوں لگے- شاید یہی محبت ہے- آپ نے قبولیت کی سند عطا کی- اور یہ یاد رکھیں- پہل آپ کی طرف سے ہوئی تھی- وقت کے ساتھ ساتھ دوستی- پیار پہ توجہ کا تقاضا بڑھنے لگا- آپ کی بے قراری بھی کئی دفعہ نوٹ کی- جو کہ مجھے مزید بے چین کر دیتی ہے- آپ میرے دل کے خلا میں فٹ ہو گئے- بس اتنا ہی ہوا تھا- پہلے اپنا اسیر کیا- اب پیچھے ہٹ رہے ہیں- کیوں آخر؟ اب آپ کو یاد آیا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا-

وہ چیخ پڑی- دل غم سے لبالب تھا- آپ ختم کر دیں اس تعلق کو- اس نے غصے بھرا میسیج کیا- اور جواباً سارے پیغامات ختم کر دیئے- اسفر نے فون کیا تو اس نے غصے سے اٹھایا ہی نہیں- وہ بھرپور غصے میں تھی- بے حد دکھی اور ڈپریشن کا شکار- بلڈ پریشر بھی بڑھنے لگا تھا- دل کو دھکا سا لگا تھا- روح پر مردنی چھا گئی- سارا دن سوچتی رہتی اور کوئی بات نہ سوجھتی- اس کی باتیں- اس کے خیال- اس کے خواب- اس کی ہنسی- اس کی شاعری- اس کے شاندار جملے- وہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگی- خود اس راستے پر لگا کر اب جان چھڑا لی ہے- وہ بہت دکھی تھی- اس نے پھر دکھی ہو کر میسیج کیا- ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی چھوڑ دیجئے- ختم کر دیجئے یہ تعلق- میں یہ دکھ سہہ لوں گی- آئندہ مجھ سے بات نہیں کرنی- وہ غصے میں تھی-

اچھا معاف کر دو- وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا- مگر ہونی اپنا وار کر چکی تھی- اس کی معافی بھی شیریں کا ٹوٹا ہوا دل نہ جوڑ سکی- ان باتوں پر یقین کرنا مشکل تھا- لمبے لمبے وقفے آنے لگے- بس ہمارا تعلق یہیں تک تھا- آپ خوش رہیں- آپ نے میری محبت کی توہین کی ہے- میں کبھی آپ کو معاف نہیں کروں گی- یہ اس کا آخری میسیج تھا- اور شاید وہ اب چاہتا بھی یہی تھا- اس نے بھی جواباً غصے کا اظہار کیا- وہ اس منانا بھی نہیں چاہتا تھا- کہ اس کی دلداری کرتا- اس نے اسے فیس بک پر بھی بلاک کر دیا- یہ تھی اس کی توجہ اور محبت- شیریں کو

حیرت بھی ہوتی تھی۔ شیریں کا غصہ کرنا تو بنتا تھا کہ وہ توجہ مانگتی تھی۔ مگر اسفر کا غصہ کرنا تو نہیں بنتا تھا۔ وہ جانتا تھا، غصہ اور جھگڑا اس لیے تھا۔ یہ تو محبوبیت کی اِک ادا تھی۔ اِظہار کا اِک انداز تھا۔ مگر اسفر جان بوجھ کر انجان بن گیا۔ کس آسانی سے اُس کی جان چھوٹ گئی تھی ۔وہ سمجھ دار تھا۔ شیریں کی طرح نادان نہیں تھا۔ وہ کتنے ہی دن اُس کی اِس حرکت پر پیچ و تاب کھاتی رہی۔ جلتی، کڑھتی، سُلگتی، تڑپتی، جیتی، مرتی۔ وہ سارا غصہ اپنی جان پر نکالتی رہی ۔ ایک دن، دو دن، ہفتہ، دس دن، مہینہ اور پھر دن پر دن گزرتے گئے۔ اسفر نے اخلاقاً بھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ اور وہ کسی شیریں نام کی لڑکی کو جانتا تھا۔ یا اُس نے اُسے محبت کے جھولے میں بٹھایا اور اور خلاؤں میں چھوڑ دیا۔ خود کہیں غائب ہو گیا۔ اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہی۔ سارا سارا دن وہ فون کا انتظار کرتی۔ وائس ایپ میسج کا انتظار کرتی۔ مگر سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ کسی سراب کے پیچھے بھاگتی رہی۔ اُس نے تو کچھ طلب بھی نہیں کیا تھا۔ پھر اُس سے یہ سب کچھ کیسے چھن گیا۔ نہیں مجھے نہیں جینا۔ مجھے اُس کے بغیر نہیں جینا۔ اُس نے تعلق ختم کیا تھا۔ میں سانس ہی ختم کر دوں گی۔ ایک لمحے کی دیر تھی۔ بس پانی کے اُوپر چند بلبلے اُبھرے اور کہانی ختم۔ کسی نے بھی نہ دیکھا۔ یہاں کیا ہوا تھا۔ دریا کے ویران کنارے کو آباد کرنے والی نے اُسے پھر ویران چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی کی محبت کی آزمائش کرنے کو۔

اُس کی لاش ملنے کے بعد اخباروں میں خبر آئی تھی۔ تھانے میں رپورٹ درج تھی۔ گھر والوں کی دُنیا ویران ہوئی تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی شیریں کیسے اپنی جان لے سکتی ہے۔ اسفر نے اخبار میں پڑھا تھا۔ شیریں۔ اس نام کی تکرار نے اُس کا چین سکون برباد کر دیا تھا۔ موبائل پر وائس ایپ چیک کیے۔ جا بجا اُس کی فریاد، اُس کی پکار بکھری اُسے اپنی اور بلاتی تھی۔ یہ میں نے کیا کیا۔ اچھی بھلی زندگی سے بھرپور محبت کو موت کے حوالے کر دیا۔ میں کیسا بدنصیب ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہوئی تھی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ سارا دن وہ اُس کے میسج دیکھتا۔ خود کو کوستا۔ خود پر لعنت بھیجتا رہتا۔ میں اُس کا قاتل ہوں۔ میں اُس کا قاتل ہوں۔ سارا دن یہی پکار اُس کے وجود کو کاٹتی رہتی۔ زندگی یکدم ہی بے معنی سی لگنے لگی تھی۔ میں کتنا بزدل ہوں۔ اُس کے ساتھ مر بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے جینے کی آس تو دلا سکتا تھا۔ وہ سارا دن پچھتاووں کی آگ میں سُلگتا رہتا۔ زندگی ہر وقت تو ہاتھ نہیں پکڑتی۔ زندگی کے ریڈار پر کبھی کبھی خوشی نظر آتی ہے۔ اُسے پکڑ لینے میں ہی بھلائی ہے۔ ورنہ تو ہر شخص اسفر کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

انتظار

ہماری زندگی ایک ریلوے سٹیشن ہے جہاں ہم ٹرین کا انتظار کرتے ہیں، لیکن نہ تو ٹرینیں ختم ہوتی ہیں نہ انتظار میں اس دن دفتر سے واپس آرہا تھا کہ میرے کانوں میں موبائل میسیج الرٹ گونجی۔ چلتی ہوئی کار میں میں نے میسیج پڑھنے کی کوشش کی۔

''میں آج رات نو بجے تمھارے ریلوے سٹیشن پہنچوں گی۔ رات کو تمھاری فیملی کے ساتھ قیام کروں گی۔ صبح دوسری ٹرین سے اپنی اگلی منزل کے لئے روانہ ہوجاؤں گی''

یہ ناہید کا میسیج تھا.. میں حیران تھا پانچ سال کی جدائی اور خاموشی کے بعد جبکہ ہمارے سارے تعلق اور سارے رابطے منقطع ہو چکے تھے، اچانک اس نے زندگی کے خاموش سمندر میں پتھر کیوں پھینکا تھا۔

مجھے اپنے خوبصورت ماضی کی خوبصورت یادوں نے اچانک اپنے حصار میں لے لیا۔ کالج کے حسین شب و روز اور ایک دن کالج لائبریری میں ناہید سے اچانک آمنا سامنا۔ میری پسندیدہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی جسے اپنے نام جاری کرانے کے لئے میں لائبریرین کے سامنے موجود تھا.. اچانک وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے سرخ وسفید چہرے پر کچھ پریشانی جھلک رہی تھی۔

''معاف کیجئے اس کتاب کو میں ایک گھنٹے سے تلاش کر رہی تھی، لیکن یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔''

اس کے حسین چہرے پر مایوسی پھیلی ہوئی تھی، ایسی مایوسی جسے دور کرنے کو میں اگر بادشاہ ہوتا تو اپنی سلطنت اس پر وار دیتا۔

''یہ کتاب آپ انھیں جاری کر دیجئے، میں بعد میں لے لوں گا''

کتاب میں نے لائبریرین کی میز پر رکھی اور تیزی سے چلتا ہوا لائبریری کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔

دوسرے دن جب میں لائبریری میں بیٹھا ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا تو وہ اچانک ایک کرسی قریب لا کے بالکل میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''نیکی کر کے کل، ایسے اچانک غائب ہوگئے کہ شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ اس ادائے بے نیازی کو کیا نام دیا جائے''

اجمل اعجاز

اس کی آنکھیں میرے چہرے پر تھیں۔
"میڈم یہ چھوٹی سی بات تھی، آپ کو کتاب کی ضرورت تھی، اس لئے......"
"چلئے مان لیتے ہیں، آپ نے احسان کیا لیکن، اتنی عجلت میں بھاگنے کی کیا ضرورت تھی"
وہ مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی
"آپ بھاگنے کا سبب جاننا چاہتی ہیں" میں نے اس کی آنکھوں کو پہلی بار غور سے دیکھا۔
"جی، بالکل، مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع تو دیا ہوتا" وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں خاموش تھا۔
"ارے کچھ تو بولئے، پلیز میرے سوال کا جواب دیجئے ناں" وہ میرے جواب کے لئے بے چین تھی۔
"سچی بات یہ ہے"...... میں کہتے کہتے رکا۔
"ہاں، ہاں، بتائیں، میں سننا چاہتی ہوں"
اس کی شوخ نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔
"سچی بات یہ ہے......" میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ "اب بتا بھی دیں پلیز" اب اس کے لہجے میں التماس تھی۔
"کہیں میری بات آپ کو بری نہ لگے..."
میں نے پہلی مرتبہ اس کے سرخ و سفید چہرے پر نظر ڈالی..
"ارے نہیں جناب، آپ بتائیں پلیز" وہ بضد تھی۔
"سچی بات یہ ہے کہ آپ کے حسن لازوال نے مجھے مسحور کر دیا تھا" میں بہت مشکل سے یہ چند الفاظ منہ سے کہہ پایا۔
"اب میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے الفاظ نہیں ہیں.. چلیں مجھے اپنے ساتھ چائے کا ایک کپ پینے کی سعادت عطا فرمائیں"
اس نے میری کلائی کو اپنے خوبصورت نرم و ملائم ہاتھوں کی گرفت میں تھام لیا۔ میں بھی جیسے کچے دھاگے میں بندھا ہوا اس کے ساتھ ساتھ کینٹین میں پہنچ گیا۔ وہ پہلی ملاقات دوستی میں ڈھلی اور پھر ہم دونوں محبت کے ایک لازوال رشتے میں بندھ گئے۔ ساتھ جینے مرنے اور رہنے کے عہد و پیمان ہوئے اور زندگی کی ساری رعنائیاں اور خوشیاں ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جب شادی کا موقع آیا تو روایتی بندشوں نے ہمارے راستے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیئے۔ اس کی شادی وہاں ہوئی، جہاں وہ جانا نہیں چاہتی تھی اور میری وہاں، جسے میں نے کبھی پسند کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس درمیان ناہید نے مجھ سے کوئی رابطہ کیا نہ میں نے پرانے تعلق کو بحال رکھنے کی کوئی کوشش کی۔
آج پانچ سال بعد وہ اچانک میرے گھر آ رہی تھی۔
میں نے اپنی بیوی کو فون پر آیا ہوا میسج دکھایا تاکہ وہ ذہنی طور سے اس کے استقبال اور خاطر مدارات کے لئے تیار ہو جائے۔
"کس لئے آ رہی ہے یہاں؟" اس کی

آنکھوں میں، کچھ اندیشے چھپے تھے۔
”وہ، اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوگی۔ ہمارا شہر راستے میں ہے۔ دوسری ٹرین کے حصول میں صبح تک کا وقفہ ہے، سوچا ہوگا میری فیملی سے تعارف ہو جائے“
میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
”وہ اب دو بچوں کی ماں ہے اور تم بھی بیوی بچوں والے ہو، اب تک تو اسے تمھارا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے تھا“
سارا کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔
”پلیز، غصہ مت کرو، میرا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے صفائی پیش کی۔
”تعلق نہیں ہے تو تمھیں میسج کیسے اور کس لئے آیا اور تعلق نہیں ہے تو تم دونوں کے پاس فون نمبرز ابھی تک کیوں محفوظ ہیں“
اب میرے پاس اپنی صفائی کا کوئی جواز نہیں تھا۔۔
”پلیز! سارا، یقین کرو، بخدا ایسا کچھ نہیں ہے“
میں نے اسے یقین دلایا اور سٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگا۔
گاڑی آنے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔
میں بلا کسی سوچ کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔
پھر بک سٹال پر رکھی کتابوں پر نظر ڈالنے لگا، وقت کٹنا کتنا مشکل تھا، صرف میں جان سکتا ہوں۔۔ بالآخر ٹرین آئی اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے سٹیشن پر رکی۔۔ میں جلدی جلدی مختلف ڈبوں میں نظر ڈال کر اسے تلاش کرنے لگا لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ مایوسی نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔۔
ٹرین نے سیٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ پلیٹ فارم اب خالی تھا۔ چند مسافر اترے تھے اور چند سوار ہوئے تھے۔
میں مڑ مڑ کے پیچھے دیکھ رہا تھا جب مایوسی کے ساتھ اپنا بے جان جسم گاڑی کی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی سٹارٹ کی۔
گھر پہنچا تو سارا گیٹ پر موجود تھی۔
”کیا ہوا، تمھارے مہمان کہاں ہیں؟“ اس نے گاڑی میں جھانک کر پوچھا۔
”مجھے علم نہیں وہ کیوں نہیں آئی“
اسے بھی ناہید کے نہ آنے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔
میں اپنے بے جان وجود کے ساتھ بستر پر گر گیا اور ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔۔
صبح دفتر کی چھٹی تھی۔ ناہید نے بھی جلد نہیں اٹھایا۔
”اگر تم نے آنا نہیں تھا، تو میسج کیوں کیا تھا، میں دیر تک سٹیشن پر تمھیں تلاش کرتا رہا“
گزشتہ پانچ سالوں میں یہ ناہید سے میرا پہلا رابطہ تھا۔
”بہت معذرت، یہ میسج میں نے اپنی سہیلی گلنار کو بھیجا تھا، جو غلطی سے تمھارے پاس چلا گیا“
یہ ناہید کا جواب تھا۔
ہماری زندگی ایک ریلوے سٹیشن ہے جہاں ہم ٹرین کا انتظار کرتے ہیں لیکن نہ ٹرینیں ختم ہوتی ہیں نہ انتظار۔

☆☆☆☆☆

لاملبوس

سحری:

'کیا یہ بھیجے جانے کے لیے تیار ہے؟' ایک نے دوسرے سے سوال کیا۔ 'ہاں تقریباً' دوسرے نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ 'غور سے دیکھ لو کچھ رہ نہ گیا ہو۔' ہم ان کو سن رہے تھے، پھر اچانک ہمارے چہرے پہ لگے دو موتی روشن ہو گئے اور اچانک ہم دیکھنا بھی شروع ہو گئے۔ یہ دیکھ اور سن رہے ہیں، کام پورا ہو چکا ہے۔ پہلے نے دوسرے کو بتایا۔ 'سمجھ رہے ہیں'؟ دوسرے نے پھر سوال کیا۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کہیں اور مصروف ہے، ہم انہیں بتانا چاہتے تھے کہ ہمیں محسوس بھی ہو رہا ہے، دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے علاوہ۔ لیکن ہم بول نہ پائے صرف خاموش سوچ اور نظر کی زبان متحرک تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں ہمارے دائرہ ادراک سے نکل گئے، اور ایک تیسرا انھیں کا ہم شکل نزدیک آیا، ہم اس کو گھور کر دیکھ رہے تھے، جب اچانک اس نے ہمیں اٹھایا اور زور سے ایک گھپ اندھیرے سوراخ میں پھینک دیا۔ لیکن آخری آواز ہم سن چکے تھے، جب دوسرا تیسرے سے چیخ کر کہہ رہا تھا، 'رکو رکو، اس روح میں بڑی چپ ابھی نہیں لگی تھی'۔۔۔

صبح:

ہم شدید تکلیف میں ہیں، یوں لگتا ہے جیسے کسی چیز سے ٹوٹ رہے ہیں۔ ہمارے جسم کے ایک حصے میں شدید محرومی کا احساس ہے، یہ وہی مقام ہے جہاں پر سے ہم اس سے الگ ہوئے، لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا، بس دھکے اور جھٹکے پڑھ رہے ہیں، کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک سخت دیوار سے ہمارا سر ٹکرا رہا ہے بار بار، اور ہم اس وقت اندھیرے میں اکیلے ہیں۔ دیوار کے دوسری طرف کوئی شدید کشش ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کبھی ہمیں لگتا ہے کہ ہم جیسے بہت سے سر ہیں اور اس گھپ اندھیرے سے نکلنے کو وہ سب اس دیوار سے بار بار ٹکرا رہے ہیں۔ پھر اچانک راستہ بنا اور ہم نہ جانے کدھر جا گرے۔ باقی سب کدھر گئے؟ ایسے لگا کہ یاداشت پیچھے اندھیرے میں ہی رہ گئی اور ہم اچانک شدید روشنی میں روشن ہو گئے۔ آخری منظر یہ تھا کہ ہمیں بہت سی آنکھیں دیکھ رہی تھی، اور ایک چیخ کی آواز جو ہماری اپنی تھی اور پھر شور ہی شور۔۔۔

نغمانہ صدیقی

دوپہر:

ہم ایک دکان میں تھے ادھر بہت سے لوگ تھے۔ ان میں اور ہم میں ایک واضح فرق تھا وہ سب ملبوس تھے، اور ہم برہنہ، ہم ایک قطار میں تھے۔ باری باری ہم سے آگے جو کہ ہماری ہی طرح برہنہ تھے، سامنے کھڑے ہم سے ایک نقش کے پاس جاتے تھے، جو کچھ نہ سمجھ آنے والی حرکتوں کے بعد اونچی آواز میں کچھ بولتا تھا۔ ہم نے غور کیا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ 'چھوٹا سائز' یا وہ آواز لگاتا، 'درمیانہ سائز' یا پھر 'بڑا سائز۔' تھوڑی دیر بعد ہم سے ملتا جلتا نقش کمرے سے باہر خوش رنگ ملبوس پہنے آتا، اور خوشی خوشی دکان سے باہر چلا جاتا۔ آخر ہماری باری آگئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا، 'سائز؟' دوسرے نے ہمارے سر کے پیچھے کچھ ٹٹولا' کچھ نہ ملنے پر زور سے ٹٹولا۔ ہم اس کی ان حرکتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ 'کیا ہوا؟' پہلے نے دوسرے سے سوال کیا۔ 'اس میں چپ نہیں۔' دوسرے نے جواب دیا۔ 'اچھا چلو خیر سائیڈ پہ بٹھاؤ اس کو۔' ہم حیران پریشان ان کی باتیں سننے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے پکڑ کر قطار سے نکالا، اور کسی اور طرف لے چلا۔ 'بات سنو ملبوس نہیں ملے گا؟ رنگ برنگ کا، جیسے ہم سے پہلے لوگوں کو ملا؟' ہم نے اس سے پوچھا۔ 'نہیں مجھے افسوس ہے کہ تمہیں نہیں مل سکتا' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ 'لیکن کیوں؟' ہم نے پوچھا۔ 'دیکھو دکان میں صرف تین بنیادی سائز ہیں ملبوس کے اور دو اور بھی، چھوٹے سائز سے پہلے کا، اور بڑے سائز کے بعد کا، اور جب تم لوگ آتے ہو تو اپنا سائز لکھوا کر آتے ہو، وہ ایک چھوٹی سی چپ میں لکھا ہوتا ہے، لیکن افسوس! تم جلدی میں بھیج دیئے گئے تھے، یا نجانے کس وجہ سے تمہیں وہ چپ نہ لگ سکی۔ اس لیے اب تم برہنہ ہی رہو گے۔ تم جیسے اور بھی ہیں، میں تمہیں انہیں میں لے جا رہا ہوں۔' 'لیکن تم مجھے ایسے ہی بنا سائز کے لباس دے دو۔ کچھ بھی بڑا، چھوٹا، درمیانہ، کچھ بھی۔' ہم نے اس سے کہا۔ 'دیکھو اس ملبوس پر بہت سی چیزوں کا انحصار ہے۔ باہر جا کر تم اپنے گروہ کو اسی ملبوس سے پہچانتے ہو۔ برہنہ لوگوں کا ایک الگ گروہ ہے، جو کہ ادھر باہر کی دنیا میں پاگل کے نام سے جانے جاتے ہیں، تم لوگوں کو آج تمہارے گھر بھیج دیا جائے گا، جس کو پاگل خانہ کہا جاتا ہے۔' 'اچھا واقعی!' ہم نے کچھ حیران کچھ پریشان اور کچھ دکھ اور خوشی کے ملے جلے احساس سے اس کو جواب دیا۔ 'لیکن یہ بتاؤ، ہم برہنہ پاگل، اور ملبوس سیانوں میں کیا فرق ہے؟' وہ بہت شفیق تھا آرام سے ہماری باتوں کا جواب دے رہا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ 'دیکھو تمہیں ان باتوں کی سمجھ نہیں آسکتی اس لیے کیا فائدہ بتانے کا؟' 'نہیں ہم سمجھ سکتے ہیں، ہمیں یاد ہے کہ صبح کے وقت جب ہماری تیاری ہو رہی تھی یا شاید خواری ہو رہی تھی، ہمیں تب ہی سب کچھ سمجھ

آ رہا تھا۔ ''ہاں، وہ بولا'' اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک مختلف نقش ہو، زمان و مکاں اور جنس سے آزاد، ابھی آہستہ آہستہ تمھاری یہ عارضی یادداشت اور محدود زبان بھی ختم ہو جائے گی۔ جب کسی کو بھی اس کا مکتوب ملبوس دیا جاتا ہے، تو وہ ایک مکمل طریقہ زندگی ہوتا ہے۔ اس میں زبان اور زبان کے استعمال کے اصول وضوابط سے لے کر صحیح غلط کا معیار، اپنے گروہ کے ساتھ وابستگی کے علاوہ بہت سی اور بھی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ عقل، اور اس کا بلند معیار، محبت، نفرت اور باقی تمام جذبات، چتر چالاکیاں، جنگ، امن، خواہش، خوشی، دکھ اور ان جیسی بہت سی چیزیں اسی چپ میں موجود ہوتی ہیں، جو وہ سب اس دکان سے ملبوس کی شکل میں وصول کرتے ہیں، اور اس کے بعد باہر دنیا میں چلے جاتے ہیں۔' 'باہر جا کر وہ کیا کرتے ہیں'؟ ہم نے پوچھا۔' وہ باہر جا کر اپنے حصے کا شور مچاتے ہیں، پہلے سے برپا شور میں اضافہ کرتے ہیں۔' اس نے بتایا۔' اچھا اور بھی بتاؤ، ہمیں تو زبان نہیں ملے گی، نہ ہم شور مچا پائیں گے۔ لیکن وہ ملبوس والے لوگ اور کیا کریں گے؟ 'ہمیں وہ رنگ برنگے ملبوسات بہت پسند آ رہے تھے۔' وہ جا کر اپنا جوڑا ڈھونڈیں گے، محبتوں کے ڈھونگ رچائیں گے اور نفرتیں کرنا سیکھیں گے۔ گے اپنے ملبوس کے مطابق عقل کا استعمال کریں گے، گیت گائیں گے جنگ کریں گے، خود کو صحیح اور درست سمجھنے اور سمجھانے کے لیے طاقت کے پیچھے بھاگیں گے۔ 'تم میں صرف ایک بنیادی چپ ڈلی تھی۔ جس کی وجہ سے تمھیں یہ باتیں سمجھ آ رہی ہیں، لیکن ملبوس نہ ملنے کی وجہ سے تمھیں بے زبان اور برہنہ ہی رہنا ہوگا، اور ایک دن تم واپس چلے جاؤ گے۔' وہ خاموش ہو گیا۔ ہم کدھر سے آئے ہیں؟ اور کدھر واپس جائیں گے؟ لیکن وہ جواب دیے بنا ہی جا چکا تھا۔ ہمیں ہلکا سا یاد آیا ان تینوں کی باتیں، اور اس کے بعد کالی دیوار کے ساتھ سر ٹکرانا، لیکن یہ یاد سرک رہی تھی، ہم دیکھ رہے تھے کہ ادھر ہم سے بہت سے برہنہ نقش ہمارے سامنے تھے۔ ہم بھی ان کے درمیان کہیں گھل گئے۔ اور وہ ہمیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔

سہ پہر:

'پریتو چوری کھا'، چھوٹی بچی اسے کھانا کھلاتے ہوئے بولی۔ بانس کے لمبے درختوں میں ہوا کی سرسر، پرے کالے سیاہ بادل، نہر کے گدلے پانی میں بادلوں کا عکس، تیز چلتے پانی کی جل تھل، ہلکی بوندوں کا نہر کے پانی پر ہلکے پیروں سے رقص، 'پریتو چوری کھا لے نا، تیرے کپڑے کدھر؟ بچی نے دوسرے ہاتھ سے ساتھ پڑی کٹوری میں سے دانا اٹھایا اور دُور پھینک دیا۔ میدان میں کسی فصل کے بیج بونے کے لیے ہل چلا ہوا تھا، دانا پھینکنے پر پرندوں کی ڈار کے اڑنے کی خوبصورت آواز، جیسے کسی موسیقی کی گم گشتہ دھن، جسے نجانے انسانیت کب سے آلات سے بجانے کی ناکام کوشش

میں تھی۔ بارش کے ننھے قطروں کا دھمال، تیز ہوا کا سوز، ایک لمحہ کہ جس میں یہ سب سازمل کر ایک ترنم، ایک گیت بن گئے، اور وہ بچی پریتو کے سامنے ناچتے ہوئے گانے لگی، دور آسمان کی طرف انگلی اٹھائے، 'اُڑتی پتنگ تیرا کونسا رنگ'؟ اُڑتی پتنگ تیرا کونسا رنگ'؟ اور اس گیت پر بادلوں نے، بارش کے قطروں نے، پرندوں کی ڈار نے رقص کا انداز بدلا تھا۔ پریتو کو بھی کوئی اور اک تھا، جو اس کے چوری سے بھرے منہ سے آواز نکلی، 'غوں، غوں، غوں، غوں۔' 'اوئے پاگل تو گھر سے ادھر کیسے؟ دو دیہاتی جو اس بچی اور پریتو کو گھور رہے تھے، چیخ کر بولے۔ ''کوئی شرم کوئی حیا کدھر ہے تیری ماں اسے کوئی خیال ہے تیرا تم لوگ پورے گاؤں میں گند پھیلاتے ہو۔' ایک دیہاتی گرج چمک رہا تھا، جبکہ دوسرے نے اس کے گرد کپڑا لپیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اتنی دیر میں پریتو آگے اور وہ پیچھے۔ دونوں دیہاتی ڈنڈے ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے گالیاں دیتے بھاگنے لگے۔ سرگم، تال، وہ نایاب دھن، مسرت، رقص سب سہم کر سکوت میں آ گئے، اور ہر طرف شور مچ گیا۔ چھوٹی بچی نے چوری کا برتن اٹھایا اور سر جھکائے گھر کی جانب واپس ہولی۔

رات:

اور اسی برہنگی میں رات ہو گئی۔ ہم سونے کی تیاری میں تھے۔ جب ہمیں اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ 'کون ہو تم'؟ ہم نے آنے والے سے سوال کیا۔ 'میں تمہیں لینے آیا ہوں' اس سائے سے نے جواب دیا۔ 'بھیجا کیوں تھا'؟ ہم نے دُو بدو سوال کیا۔ وہ خاموش رہا، کچھ دیر بعد بولا 'چلو تمہارا وقت پورا ہوا' 'ہمیں ملبوس کیوں نہ دیا؟ ہم نے روتے ہوئے اس سے پوچھا سارا دن ہم خاموش رہے اور یوں ہی برہنہ' چلو، وہ پھر بولا۔ 'اچھا لیکن ایک بات مان لو ہماری، لے جانے سے پہلے ہمیں ایک بار زبان دے دو ملبوس لوگوں والی، یہ والی واپس لے لو چاہے، ہمیں ایک بار ایک لمحے کے لیے وہ احساس تو دو، ہم نے التجا کی۔ 'نہیں وہ نہیں مل سکتی تمہیں اور اب تو تمہاری واپسی کا وقت ہے۔' وہ بولے۔ 'رات ہو گی واپس چلو۔ 'اچھا ہم شاید رونے والے تھے۔ نجانے اس کو رحم آیا، یا کیا، کہنے لگا اچھا تم جانے سے پہلے چیخ سکتے ہو، ملبوس لوگ بھی جانے سے پہلے یہی کرتے ہیں۔ اس نے ہمارے سر کے پیچھے اپنا ہاتھ رکھا، اور ہمیں ایسا لگا کہ ہم میں کچھ دنیا شامل ہوا ہے۔ اب ہم خوشی خوشی چیخنے کو تیار تھے۔ بڑا زور لگا کر جو کوشش کی تو کوئی آواز نہ آئی صرف زور تھا، یاد آیا، یہ تو وہی زور تھا جو صبح ہم دیوار سے سر ٹکراتے ہوئے لگا رہے تھے۔ چیخ سسکی بن گئی، ساری طاقت منہ سے نکلتے ہی نجانے کہاں تحلیل ہو گئی۔ ہماری چیخ کو بھی زبان نہ مل سکی، ہم بھی گھل رہے تھے اور آخری منظر جو ساکت ہو گیا وہ یہ تھا کہ ہماری برہنہ سی چیخ ہمارے دھانے سے بنا آواز نکل گئی، اور ہم بلکل خالی کسی گھپ اندھیرے میں کھو گئے۔

☆☆☆☆☆

مقصود وفا ___ شاعر اور شخص

مقصود وفا فیصل آباد کی سرزمین سے اُبھرنے والے ایک ذہین اور باصلاحیت شاعر ہیں۔ 'درِ امکاں' ان کا اولیں شعری مجموعہ کلام تھا، جس کی اشاعت 1994 میں ہوئی۔ شعر و سخن کی دنیا میں ان کی آمد ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھی، جس نے ادبی فرسودگی اور بے جا روایت پسندی کو بیک جُنبش قلم رد کر دیا۔ ان کی جدت لفظی، منفرد اسلوب شعری اور فنی کمال پسندی نے اردو غزل کے حسن و جمال میں اضافہ کیا۔ یہ اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔

میں ان کے شعری سفر میں غائبانہ ان کے ساتھ رہا ہوں۔ 'درِ امکاں' کی رونمائی میں بھی موجود تھا۔ 'درِ امکاں' پر ایک ریویو بھی بزبان انگریزی میں نے لکھا۔ اور یہی عمل اتنے سالوں کے بعد 'علاحدہ' کے ضمن میں دہرایا جا رہا ہے۔ اور مقصود وفا کے بقول، سلسلہ درد کا' یونہی چلتا رہتا ہے۔ 'درِ امکاں' میں ان کی تخلیقی اُپج جذب و اختصار کے خمیر سے پروان چڑھی۔ اور پھر 'علاحدہ' تک آتے آتے تضادات کی ایک پُرکشش مابعد الطبعیاتی وحدت میں منقلب ہو گئی۔ ان کے شعری وجدان کا عروج ہے، جس کے پیچھے ان کا طویل تخلیقی جُہد کار فرما ہے۔

کتاب کے بارے میں اپنے تشریحی کلمات میں ان کا اصرار ہے کہ آوازوں میں خاموشی ہوتی ہے، جسے ناظرین ایک معنوی وسعت کے ساتھ بہ آسانی دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ کیونکہ نکہتِ گل 'شکست رنگ' کی جھنکار ہی تو ہوتی ہے۔

'علاحدہ' میں 'علاحدگی' کی تین امکانی جہتوں کو باہم مدغم کیا گیا ہے۔ یعنی سکوت فرار اور خود فراموشی۔ محسوساتی سطح پر خامشی کو لحن میں، ذات سے فرار کو خود آگہی اور نفی ذات کو توکل میں ڈھالا گیا ہے۔ قاری اس تجربے میں بخوبی شامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ خود کو شاعر کی ذات میں سمو لے اس لیے کہ ادراک و اکتساب فن کا معروف نظریہ بھی یہی ہے۔

قاری کو 'علاحدہ' کی منظومات کے مطالعہ کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا خالق معاشرتی، ثقافتی اور جمالیاتی سطح پر زندگی کے نامیاتی عمل میں اپنے آپ کو 'علاحدہ' تصور کرتا ہے۔ تاہم اس پراسس میں وہ اپنے قاری کو اپنا ہمراز بنانا چاہے گا کہ وہ بھی اس کے خواب و خیال کی دنیا میں جھانک سکے۔ اور اُس کے 'درد' میں شریک ہو سکے۔ خود فریبی سے خود آگہی کے ایک طویل سفر میں شاعر پر کیا گزرتی ہے، اس اجمال کا شعری انکشاف 'علاحدہ' کا عنوان و موضوع ہے۔

نکل کے زخم تمنا کے رنگ و روغن سے
دکھائیں گے تمھیں اک روز خواب دوسرا بھی

.....

اپنی غزل میں شاعر اسی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ 'وقتِ سرود درد کا ہنگام' اور رات کے بھیگنے پر 'غزل ابتدا' کرنا ہی اسی عمل کا ایک حصہ ہے۔ شاعر کی پیغام رساں اس کی حسیات ہیں، اُس کا تکلم یا تبسم نہیں۔ موجودہ مجموعے میں کوئی پینسٹھ کے قریب غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جن کے

سید افسر ساجد

مشترکہ موضوعات ہیں: خواہش کی لاتعینیت، فراق کے دکھ، تنہائی کا کرب، خوابوں کی پامالی، تشکک، حقیقت کا وجدانی ادراک اور زندگی کے کائناتی تغیر وتبدل کا فلسفیانہ شعور:

اس زیارت گہہ تمنا میں
ہم بھی پھرتے ہیں زائرین کے ساتھ

سہہ لیا تلخی امروز کو اتنا کہ وفا
اب کوئی وعدہ فردا بھی نہیں چاہیے ہے

ٹھکرا نہ دوں یہ منزلِ کشف وکمال بھی
آوارگی شام کوئی مشورہ ہی دے

خالی خالی تھی لوحِ آب و ہوا
اس پہ تصویر سی بنا آئے

یہ جو میں، خواب دیکھتا ہوں بہت
یہ کوئی اور سلسلہ تو نہیں

تاہم نظم میں شاعر ذرا سہولت سے انکشافِ احوال کرتا ہے۔ یہاں وہ فلسفہ اور مابعد الطبیعات سے بھی الجھتا نظر آتا ہے:

کسی اجنبی خامشی میں
کسی اور دنیا کا دروازہ کھولوں
جسے سوچ سکتا نہیں میں
اسے بھی پکاروں
میں خود کو بکھیروں، سنواروں
میں جو چاہے کرلوں
مگر!
دسترس سے پرے اس ہوا میں
پھسلتی ہوئی زندگی جو مرے اختیارو بیاں
میں نہیں ہے
اسے اپنی مرضی سے کیسے گزاروں؟
(نارسائی سے بھری ایک نظم)

ہمارے دوست ڈاکٹر جاوید انور ایک خوبصورت انسان، قابل مسیحا اور معتبر شاعر تھے۔ دکھ شدہ خوابوں کا نوحہ انور کے لیے ایک دلفگار نوحہ ہے:

اُٹھ جاوید انور اب اُٹھ
اپنے پیاروں کی خاطر
جلتے سگریٹ کے شعلے سے
اپنے پیڈ پہ نسخہ لکھ اور نظم مکمل کر
ان خوابوں کا نوحہ لکھ
جن خوابوں کا آخری حصہ
تیری قبر کی مٹی چاٹ رہی ہے!

اس طرح نظم ”آفرینش“، مقصود وفا کی شعریات کا ایک دلفریب منظر نامہ ہے:

کیا ملا خواب رائیگاں سے ہمیں
خشت و آہن کی اس ترقی سے
اپنے مدفن کی جڑ سے اُگتی ہوئی
ہر عمارت کی شکل ایسی ہے
جیسے ویران ہو رہا ہے جہاں
جیسے مسمار ہو رہی ہے زمیں
اس شکستِ ہنر کی بیل اوپر
ان کے کتبے تلاش کیا کیجیے
جن کی خبریں ہیں گم زمانے میں

آوازوں کے اس جم غفیر میں، شاعر اپنی خامشی کے اظہار اور اخراج کے لیے مناسب الفاظ واستعارے تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ اس فاصلاتی علاحدگی میں وہ قاری کے ساتھ ایک ربط باہم قائم کرنے میں کس درجہ کامیاب ہے ’علاحدہ‘ خود اس کا جواب ہے۔ اپنے طرزِ ادا، مواد اور خوش آہنگ اسلوب کی بنا پر اسے جدید اردو میں ایک مقام اعتبار وامتیاز حاصل ہونے کا قوی امکان ہے:

گریہ زاری کی یہ تاثیر کہ اب مرغ چمن
میری آواز میں آواز ملانے لگا ہے

☆☆☆☆☆

اردو تنقید کا ادراکی دبستان از فرحت عباس شاہ ___ ایک تعارف

ارسطو سے لے کر عہد جدید تک بے شمار نظریات ہیں جن میں کسی نے تخلیق کو نت نئی شاہراہوں سے آشنا کیا تو کسی نے گمراہیاں اور الجھنیں کھڑی کر کے تخلیق کو راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ کہ جب اتنے نظریات موجود ہیں تو ادراکی تنقید کیوں، اور آخر یہ ادراکی تنقید ہے کیا؟

ادراکی تنقید اس لحاظ سے کوئی نامانوس یا مخصوص نتائج حاصل کرنے کے لیے ڈیزائن کی گئی تھیوری نہیں اور نہ ہی اس کا مقصد اپنی علمیت کے رعب سے پیچیدہ مباحث اٹھا کر ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے ذوق کا امتحان لینا مقصود ہے بلکہ یہ ایک سیدھا سادہ تخلیقی نظریہء تنقید ہے جس کی بنیاد انسان کے فطری ادراک پر استوار ہے ۔ ہر انسان میں ادراک کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ اپنے اسی ادراک کو بروئے کار لا کر اور خاص مقاصد کے تحت لائے گئے مصنوعی نظریات کو رد کر کے جب کسی تخلیق کی تہہ میں پوشیدہ کیفیات اور داخلی جذبات واحساسات کے ساتھ خارجی اثرات و پس منظر کی روشنی میں صرف ادبِ عالیہ کے نظریے کے تحت کسی تخلیق کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ادراکی تنقید کہلائے گی۔ اس حساب سے ادراکی تنقید درحقیقت وسیع النظری کا نظریہ ہے جس کے نزدیک حقیقی اہمیت تخلیقیت اور داخلی کیفیات کی ہے۔ اس دبستان میں کئی دبستانوں کا امتزاج بھی موجود ہے لیکن اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھنے کے سبب یہ ایک الگ اور منفرد دبستان ہے۔ داخلی جذبات و احساسات اور شعریت و تخلیقیت کے سلسلے میں یہ دبستان عسکری سکول آف تھاٹ سے روشنی لیتا ہے اور خارجی اثرات میں اس نے کئی نظریات سے استفادہ کر کے اپنا ایک نقطہ نظر مرتب کیا ہے جس کا تعلق فرد کے جذبات تو احساسات کے ساتھ ہے ۔ مجموعی تاثر اس دبستان کا سارے مکاتب فکر سے الگ ہے۔

ادراکی تنقید کسی بھی اچھی تخلیق کو یہ کہہ کر رد نہیں کرتی کہ یہ رومانی ہے یا ترقی پسند ہے۔ یہ نظریہ ہر شاعر اور ادیب اس کی فکری اکائی کو سامنے رکھ کر اس کے فن سے بحث کرتا ہے۔ کسی تخلیق کار پر اس کی فکری

نظیر ساگر

اکائی کو نظر انداز کر کے اپنا نظریہ مسلط کرنا اس تنقید کا منصب نہیں۔

میں اس تنقید کو جدید تنقیدی نظریات کے خلاف ایک شدید اور طاقتور ردعمل سمجھتا ہوں۔ جدید تنقید نے جس طرح پیچیدہ اور لایعنی مباحث اٹھا کر تخلیق کاروں اور قارئین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایک ردعمل تو بہر حال آنا تھا، یہ کام ادرا کی تنقید کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔ جدید تنقید کی گمراہیوں کا سن کر شائد پہلا سوال قارئین کے دل میں یہ آئے کہ آخر جدید تنقید نے کونسی گمراہیاں پھیلائیں جن کے ردعمل میں ادرا کی تنقید سامنے آئی، تو اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ جدید نظریات میں ساختیات، پس ساختیات یا مابعد جدیدیت کا کوئی بھی نظریہ ادب کا نظریہ نہیں۔ تخلیق انسان کے داخل سے پھوٹتی ہے۔ اس میں انسانی جذبات و احساسات، داخلی کیفیات، آمد، تخلیقی عمل اور مابعد الطبیاتی عوامل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جدید نظریات میں کوئی نظریہ ان سے بحث نہیں کرتا۔ اپنے مقاصد کے تحت کچھ مصنوعی نظریات تراش کر انھیں ادب کے رہنما اصول بنانے کی ناکام کوشش ایک عرصے سے جاری ہے جن کا اطلاق بالعموم دنیا کے ادب پر اور بالخصوص اردو ادب پر آج تک نہیں ہو سکا۔ اس کا واضح ثبوت دیکھنا ہو تو صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ نئی تنقید میں نظریات کی تبلیغ اور گمراہ کن، پیچیدہ مباحث سے سینکڑوں کتب بھری پڑی ہیں لیکن اطلاقی جہات پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا۔ اگر اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے کچھ اطلاق ہوا بھی ہے تو ایسے سطحی ادیبوں اور شاعروں تک محدود رہا ہے جن کو شائد ہی کوئی جانتا ہو۔ کلاسیکی ادب پر نہ ان کا اطلاق ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ نظریات ادب کو پرکھنے کی کسوٹی فراہم نہیں کرتے بلکہ اپنا مقصد ادب میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جو ان کو کسی سطحی افسانے یا نظم میں مل جاتا ہے تو اسی کو موضوع بنا لیتے ہیں اور یہ کام ادبی تنقید کا ہرگز نہیں۔

اپنے دفاع میں پھر ان نظریات کے مبلغ کچھ اس طرح کی من گھڑت باتیں گھڑ لیتے ہیں کہ یہ نظریات مذہب، تہذیب اور علاقائیت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور استعماری رویوں کو رد کرتے ہیں لیکن یہ مبلغ شاید یہ بات بھول جاتے ہیں، جس کی طرف حسن عسکری نے بھی اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے خدا کے نام پر اپنا ایک خدا تخلیق کیا ہے اور مذہب کے نام پر اپنا مذہب بنایا ہے۔ حسن عسکری کے اس قول پر کافی غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قول میں پوری صداقت نظر آتی ہے کہ مہابیانیے کو مسترد کر کے ان نظریات نے مذہب پر ضرب لگائی ہے اور تخلیق کے خالق کی موت کے اعلان سے ذہن نطشے کے اس

قول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ ''خدا مر چکا ہے''۔ یہاں ہمارا موضوع نہ تو خدا ہے نہ مذہب، صرف یہی مقصود ہے کہ آفاقیت کو رد کر کے علاقائیت کی طرف رجوع دراصل عام انسانی جذبات و احساسات کا انکار ہے جو عالمگیر ہوتے ہیں۔ تنقید کا کام یہ نہیں ہوتا کہ ادب میں ایک خاص مقصد کے لیے چیزیں تلاش کی جائیں، تنقید بذات خود ادب کی تفہیم اور ادب عالیہ کے نظریے کے تحت ادب کی رہنمائی کا نام ہے جو بڑے ادب کو سطحی ادب سے الگ کر کے فن پاروں کی درجہ بندی کرتی ہے۔ جدید تنقید شعر میں شعریت، کیفیات اور جذبات و احساسات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی، مثلاً فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' پر تنقید کرتے ہوئے تانیثی تنقید صرف یہ دیکھتی ہے کہ یہاں شاعر محبوب کو چھوڑ رہا ہے لیکن اس کی مرضی نہیں پوچھ رہا لہٰذا یہ مرد بالادست نظام میں تخلیق کی گئی ایک سطحی نظم ہے۔ اس نظریے کے تحت ادب تو خاطر خواہ تخلیق نہ ہو سکا، تاہم معاشرے پر اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ ''میرا جسم میری مرضی'' کے نعرے لگنے لگے۔ اسی طرح ساختیات آپ کو لفظوں کے تہہ میں چھپے معنی کا پتا کر تہذیب تک لے جائے گی لیکن شاعر، شاعری، شاعر اور غیر شاعر میں فرق، داخلی کیفیات اور شعریت کا ذکر وہاں بھی نہیں ملے گا، لہٰذا یہ نظریہ لسانیات کی حد تک تو درست ہو سکتا ہے ادب پر اس کا اطلاق جائز نہیں۔

روتشکیل کا نظریہ شاعر کی فکری اکائی کو نظر انداز کر کے ایک ایسا مضحکہ خیز انداز اپناتا ہے کہ جیسے کوئی ابتدائی طالب علم کسی فن پارے کی غلط تشریح کر رہا ہو۔ اسی طرح پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تمام نظریات کا یہی حال ہے۔ جب جدید نظریات نے تنقید کے مقصد سے ہی انکار کر دیا اور ادب میں ادب تلاش کرنے کے بجائے خاص مقاصد تلاش کرنا شروع کیے تو فرحت عباس شاہ نے نقاد کی موت کا اعلان کیا۔ گزشتہ تین سال سے نقاد کی موت کا اعلان ہوتا رہا تاہم صرف موت کا اعلان کر کے خاموشی اختیار کرنا بذات خود ایک جرم تھا کیونکہ موت کے بعد جدید نقاد کی موت کے اسباب بھی دلائل کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھے جو آج ادرا کی تنقید کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔

جدید تنقید سے آگے بڑھ کر ادرا کی تنقید کا دوسرا کام ان ناقدین پر گرفت کرنا ہے جنھوں نے تخلیقیت اور شعریت کے ساتھ ساتھ بڑی فکر رکھنے والے شعرا کو نظر انداز کر کے چند ایسے شعرا کو بڑا مقام و مرتبہ عطا کیا جو اس کے اہل نہیں تھے۔ ان کی شاعری کو مبالغے کی حد تک بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور حقیقی شعرا پس منظر میں چلے گئے۔ ادرا کی تنقید کی نظر میں

چونکہ ادب نہ صرف چند نفسیاتی بیماریوں کو شعر میں ڈھالنا ہے نہ خواہ مخواہ کے فلسفیانہ مباحث کا نام ہے۔ اگر فلسفہ اور نفسیات یا دیگر علوم و فنون ادب کا حصہ بنیں گے بھی تو اس کی بنیادی اساس داخلی کیفیات اور جذبات و احساسات اور خارجی پس منظر ہوگی۔ ان ناقدین نے جتنے شعرا پر لکھا ان کا بھی وہی شیوہ رہا جو جدید تنقید کا ہے۔ کسی بھی شاعر پر بات کرتے ہوئے انتخاب میں مجبوراً انھیں شاعر کا سطحی کلام لانا پڑا اور اصل شاعری شاعر کے مجموعوں میں ہی پڑی رہی۔ اس کے برعکس اور اکی تنقید پہلے شاعری کا انتخاب کر کے اعلیٰ نمونوں کو سامنے رکھتی ہے پھر تخلیق کار کے تہذیبی، سماجی، نفسیاتی معاشی اور سیاسی عصری پس منظر کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کی بنیاد پر سوالات اٹھاتی ہے۔ میر اجی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج تک لکھا جا رہا ہے لیکن آج تک مجھے ان کی ایک نظم بھی متاثر نہ کر سکی۔ چند نفسیاتی بیماریوں کے سوا ان کی شاعری میں شعریت، داخلی کیفیات اور جذبات و احساسات کا نشان تک نہیں ملتا۔ مجھے انسانی نفسیات کے بیان سے ہرگز اختلاف نہیں یہ بھی ایک داخلی کیفیت ہے لیکن ادب کے تقاضے پورے کیے بغیر نفسیات کا بیان سب سے بہتر ہمیں فرائڈ، ژونگ اور اڈلر کے ہاں ملتا ہے اس بیان کو شاعری کے نام پر دہرانے کی ہرگز ضرورت نہیں جب تک اس میں کوئی نیا پہلو تلاش نہ کیا جائے یا پھر اسے تخلیق کا رنگ نہ دیا جائے۔ میر اجی کے ہاں نہ نفسیات کے حوالے سے کوئی نئی چیز نظر آتی ہے نہ ہی شعریت کے تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ہندی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی یہی حال ہے۔ جدید شاعری کے نام پر جو کچھ اس دور میں لکھا گیا اس میں صرف انہی چیزوں کو ادرا کی تنقید موضوع بحث بناتی ہے جو تخلیق کے عمدہ نمونے کہلانے کے لائق ہیں، باقی ساری چیزوں کو مع تنقید دلائل کے ساتھ مسترد کرنا ادرا کی تنقید کا منصب ہے۔ یہی کام ادرا کی تنقید ابتدا سے لے کر حال تک تمام ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کرے گی جس میں بہت سارے شعرا و ادبا کی از سر نو درجہ بندی ہوگی۔ مثلاً میر و غالب کا موازنہ کرتے ہوئے ادرا کی تنقید کا بنیادی کام یہ دیکھنا ہوگا کہ کس شاعر نے داخلی کیفیات، جذبات و حساسات اور اپنے عہد کے رویوں کو کس انداز سے شعر کیا ہے۔ یہاں یقیناً ادرا کی تنقید کی کسوٹی پر میر کا پلڑا بھاری نظر آئے گا۔ غالب کے خیال کا پرندہ چاہے آگہی کے دام شنیدن میں نہ آ سکے لیکن یہ سچ ہے کہ یہ عنقا لاکھ کوشش کے باوجود اس داخلی کیفیت کو چھو بھی نہیں سکتا جو میر کے کلام کی جان ہے۔ یہاں ہمارا مقصد غالب کے مقام و مرتبے کو گھٹانا یا انھیں سطحی شاعر ثابت کرنا ہرگز نہیں، وہ عظیم شاعر ہیں لیکن اس کسوٹی پر میر عظیم تر شاعر ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے عہد کے خارجی حالات کے بیان کو تخلیق کا رنگ

دینے میں بھی اور داخلی کیفیات میں بھی غالب میر تک نہیں پہنچ سکتے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ادرا کی تنقید میں بڑی فکر کی اہمیت نہیں بڑی فکر کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی پیش کش کو دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور بطور خاص یہ فکر اور پیش کش ایک ذوق سلیم رکھنے والے قاری کو کس قدر آہنی گرفت میں لیتے ہیں اس پر بھی ادرا کی تنقید خاص توجہ دیتی ہے۔ گویا ادرا کی تنقید نے خالق اور تخلیق کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی اہمیت دی ہے اور قاری کے توسط سے بھی ادب کو دیکھنے، پرکھنے اور مسرت حاصل کرنے کے زاویے کو اہم گردانا ہے، لیکن یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہ قاری ہر عام قاری نہیں ذوق سلیم رکھنے والا قاری ہے۔

ادرا کی تنقید اس بحث میں نہیں پڑتی کہ کس شاعر کے ہاں فکر بڑی ہے اور کس کے ہاں اسلوب اچھا ہے۔ اس کے مطابق ہر بڑی فکر جو تخلیقی صلاحیت رکھتی ہو بڑا اسلوب ساتھ لاتی ہے۔ کوئی تخلیقی شاعر شعوری طور پر محاسن کلام نہیں لاتا بلکہ یہ چیزیں فکر کے ساتھ ساتھ خود شعر و ادب کا حصہ بنتی ہیں۔

ادرا کی تنقید اس استعاراتی اور جمالیاتی نظام کے ساتھ ساتھ لسانی ادراک کی بھی کوشش کرتی ہے اور زبان و اسلوب پر اسی داخلی اور بے ساختہ نقطہ نظر سے بحث کرتی ہے۔

ادراک تنقید کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کا اطلاق بالعموم فنون لطیفہ کے تمام فنون اور بالخصوص، ادب کی ساری اصناف پر ہوتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ پہلی ہی کتاب میں نظری مباحث مختصر مگر جامع اور اطلاقی جہات زیادہ ہیں۔ ناول، افسانہ، شاعری اور دیگر اصناف کو موضوع بنا کر تفصیل سے ادب پر اس نظریے کا اطلاق کیا ہے جس میں روایتی رویوں کو دہرانے کے بجائے نئے انکشافات موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ ادرا کی تنقید فن پارے کو سمجھنے کا ایک آسان سادہ، فطری مگر منظم عمل ہے جو غیر فطری نظریات کے ردعمل میں سامنے آئی ہے۔ جدید نظریات کو ادرا کی تنقید باقاعدہ نظریے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتی، تاہم ضمنی طور پر خارجی اثرات کے تحت ان کا ذکر کرنا بھی اپنا منصب سمجھتی ہے۔ اس نظریے کا تعلق تخلیق، تخلیق کار اور قاری تینوں کے ساتھ ہے۔ اس تنقید کی اساس داخلی ہے کیونکہ تخلیق داخل سے ہی پھوٹتی ہے لیکن داخل سے ہوتے ہوئے خارج تک کا سفر اور پھر اس کے اثر و تاثیر، مسرت، تخلیقیت، شعریت وغیرہ کی پرکھ سے مقام و مرتبے کا تعین اپنا منصب سمجھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج ادرا کی تنقید کی ضرورت و اہمیت جتنی ہے اور تخلیق کے لیے جتنا موزوں نظریہ ادرا کی تنقید عطا کرتی ہے شائد ہی کوئی اور نظریہ ایسا ہو۔

☆☆☆☆☆

سلطان رشک ۔ نیرنگِ خیال کے مدیر۔ ادب کے سفیر

کہنہ مشق صحافی ، منجھے ہوئے ادیب ، نامور شاعر ، مدیر اعلیٰ ماہنامہ نیرنگِ خیال راولپنڈی اور اردو پنچ ، یعنی سلطان رشک بھی ادبی دنیا کو داغِ مفارقت دے گئے۔ انہیں آہوں اور سسکیوں کے ساتھ 6 دسمبر کو چکلالہ اسکیم 3 کے جدید قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کا نسبی تعلق سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کے خانوادے سے تھا۔ اس لئے بھی ان کی شاعری میں متصوفانہ رنگ سامعین اور قارئین کی توجہ کا مرکز بنتا تھا۔ وہ میرے گہرے دوست سلطان ارشد القادری مدیر اعلیٰ سہ ماہی دستگیر۔ کوئٹہ کے قریبی عزیز تھے اور ان دونوں بڑی شخصیات کا ہمارے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سلطان ارشد القادری کا میری وجہ سے اور محترم سلطان رشک کا ابو (مرحوم) سے قربت و محبت کے باعث۔ یا یوں کہہ لیں سلطان رشک (مرحوم) سے مجھے دلی رغبت اور محبت اپنے والدِ بزرگوار سید فخرالدین بلے سے ورثے میں ملی۔ وہ اپنے دوست سید فخرالدین بلے صاحب سے رابطے میں رہے۔ ہمارا گھرانہ خانہ بدوش رہا۔ جب بھی تبادلہ ہوتا تو ہمارا شہر اور ٹھکانہ بدل جایا کرتا تھا۔ اسلام آباد ، راولپنڈی ، سرگودھا ، ملتان اور لاہور میں قیام کے دوران وہ اکثر ملنے کیلئے یا ہمارے گھر پر سجائے جانے والے ادبی تنظیم قافلے کے پڑاؤ میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ اور جب بھی آتے محفل کی جان بن جایا کرتے تھے۔

سید عارف معین بلے نے ان کے شعری مجموعوں کے ناموں 'دریا کی دہلیز' اور 'کاغذ کا

ظفر معین بلے جعفری

گھر' کو بنیاد بنا کر شعری زبان میں یہ سوال اٹھائے ہیں:

ناقدوں سے کیسے پوچھوں دیدہ ور کیسا لگا؟
دریا کی ہلیز پر ، کاغذ کا گھر کیسا لگا؟
دیکھ کر بتلایئے اوراقِ نیرنگِ خیال
محترم سلطان کا علمی سفر کیسا لگا؟

.....

جہاں تک مجھے یاد ہے ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں میرے والد سید فخرالدین بلے ملتان یا اسلام آباد چلے گئے تھے اور وہاں بیک وقت تین اہم جرائد ماہنامہ اوقاف، ماہنامہ ہم وطن اور ماہنامہ یارانِ وطن کے بانی چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔ انہی دنوں میں کسی ایک جریدے کی تقریب بسم اللہ میں شرکت کی لئے سلطان رشک بھی آئے تھے۔ میرا بچپنا تھا۔ وہ ہمارے گھرانے سے بھی آ کر ملے۔ مجھے ان کے لب و لہجے میں اپنائیت، محبت اور ادب دوستی محسوس ہوئی۔ انہوں نے موقع محل کی مناسبت سے ایک دو اشعار بھی سنائے۔ ابو بھی ان سے بڑی محبت سے ملے۔ ایسا لگا۔ آ ملے ہیں سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک۔ ان کی گفتگو سے محسوس ہوا کہ کئی برس بعد ان کی ابو سے ملاقات ہوئی ہے۔ تقریب شروع ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کیا۔ کچھ باتیں میری سمجھ میں آئیں، کچھ سر کے اوپر سے گزر گئیں۔

قافلے کے پڑاؤ میں انہوں نے اپنی کئی تازہ غزلیں سنائیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرتضیٰ برلاس صاحب بھی ان سے بڑی محبت کے ساتھ ملے اور قافلے کے شرکاء کو ان کے ادبی سفر کی تفصیل بھی اپنے مخصوص انداز میں بتائی۔ اس محفل میں ڈاکٹر اجمل نیازی، امجد اسلام امجد، محترمہ صدیقہ بیگم مدیر اعلیٰ ادبِ لطیف، احمد ندیم قاسمی، ظفر علی راجہ، میرزا ادیب، مسعود اشعر، طفیل ہوشیار پوری بھی تھے۔ موضوعِ گفتگو قومی اخبارات کے ادبی ایڈیشن اور پاکستان اور بھارت کے ادبی جرائد بنا رہا۔ خالد احمد نے ان سلسلوں کو ادب کی ترویج و ترقی کا وسیلہ قرار دیا۔ سرفراز سید خود بھی ادیب، صحافی اور شاعر ہیں، اس لئے انہوں نے بھی کھل کر حصہ لیا۔

مجھے یاد ہے اس کے کئی برس بعد شادمان لاہور میں واقع بلے ہاؤس میں قافلے کا ایک خصوصی پڑاؤ محترم سلطان رشک کے اعزاز میں ڈالا گیا۔ سلطان ارشد القادری، شہزاد احمد، اسلم کولسری، اداکار منور سعید، شاہد واسطی، سرفراز سید، تسلیم تصور، ڈاکٹر ظفر علی راجا، میرزا ادیب محترمہ صدیقہ بیگم، محترمہ عذرا اصغر، ڈاکٹر حسن رضوی، بیدار سرمدی، طفیل ہوشیار پوری، حفیظ

تائب ، ڈاکٹر انور سدید ، بشریٰ رحمٰن ، سعید بدر، نجمی نگینوی، ڈاکٹر اختر شمار، قائم نقوی، یزدانی جالندھری، مرتضیٰ برلاس، خالد احمد اور دیگر مستقل شرکائے قافلہ نے رونق دوبالا کردی۔ ایک اور قافلے کے پڑاؤ میں انہوں نے بڑی خوبصورت غزل سنا کر خوب داد سمیٹی۔ یقین کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میری یادداشت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ انہوں نے اپنی خاموشی یہ غزل سنا کر توڑی تھی۔

اس کی جانب دیکھتے تھے اور سب خاموش تھے
اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور لب خاموش تھے

یوں تو دل والے تھے محفل تھی مگر عالم تھا یہ
اس کا جادو تھا جو حیرت کے سبب خاموش تھے

چاند اک نزدیک سے دیکھا تھا جب سمران میں
ہم بھی کچھ کہتے پر اپنے چشم و لب خاموش تھے

اک سکوت مرگ طاری تھا چمن زادوں کے بیچ
محوِ خواب خوش دلی تھے، مثلِ شب خاموش تھے

سب کے چہروں پر لکھی تھیں خواہشیں سلطان رشک
یوں تو لب بستہ تھے سارے با ادب خاموش تھے

.....

سلطان رشک نے بڑی بھرپور زندگی گزاری - صحافت اور ادب سے وابستہ رہے۔ طنز و مزاح نگاری کے فروغ کیلئے ان کی کوششیں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ انہوں نے جو ادبی مجلہ اردو پنچ نکالا، وہ مزاح نگاروں کی مسکراتی نگارشات سے مزین ہوا کرتا تھا۔ ادب دوست بتاتے ہیں کہ اپنے دور میں اردو پنچ بڑا مقبول رہا۔ ان کا ایک اور ادبی رسالہ ماہنامہ نیرنگِ خیال ان کی پہچان بنا رہا۔ وہ زندگی کا آخری سانس لینے تک نیرنگِ خیال سے وابستہ رہے۔

سلطان رشک نے نثری اور شعری بہت سی اصناف سخن میں اپنے رنگ دکھائے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہیں، نظمیں بھی لکھیں، نعتیں بھی کہیں اور ادبی اور روحانی محفلوں میں اپنے رنگ جما کر اربابِ فکر و فن سے داد و تحسین بھی سمیٹی۔ دریا کی دہلیز ان کا پہلا مجموعہء کلام ہے اور کاغذ کا گھر ان کی دوسری شعری تصنیف۔ ان دونوں کتابوں کو ادبی دنیا میں پذیرائی ملی۔ کئی شہروں میں میرے والد سید فخر الدین بلے اور محترم مرتضیٰ برلاس بیک وقت تعینات رہے اور ادبی محفلیں بھی سجاتے رہے۔ یہ دونوں برج کے بھی کھلاڑی رہے ہیں۔ بعض دنوں میں رات گئے تک برج کی نشستیں ہمارے گھر پر بھی ہوتی رہیں۔ اداکار منور سعید، سید آنس معین بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور برج کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ ایسا

بھی ہوا کہ برج کی ٹیبل بھی ہوئی ہے اور سلطان رشک اچانک آ گئے تو ان کی آمد کے احترام میں یا انہیں خوش آمدید کہنے کی لئے ابو نے نشست موخر کر دی۔ وہ واقعی ادب دوست تھے۔ مرتضیٰ برلاس کا پہلا شعری مجموعہ تیشہء کرب ہے، یہ کتاب بھی سلطان رشک کے ادارے کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ ان کا حلقہء یاراں بڑا وسیع رہا۔ معروف ادبی شخصیات جوش ملیح آبادی، سید ضمیر جعفری، احمد فراز، سید فخر الدین بلے، کرنل محمد خان، نثار ناسک، سید عارف، شوکت مہدی، کرنل سید مقبول حسین، زاہد حسن چغتائی، ڈاکٹر رشید نثار، حکیم فضل الٰہی بہار، اور عائشہ مسعود ملک سے ان کی بڑی رفاقت رہی۔ وہ ایک زندہ دل شخصیت تھے۔ ان کی سربراہی میں مقبول جریدے نیرنگ خیال کا دفتر کئی دہائیوں تک ادبی سرگرمیوں کا مرکز اور اربابِ ادب کا محور بنا رہا، شیزان ہوٹل میں بھی سلطان رشک سورج غروب ہونے کے بعد ادبی نشستیں سجایا کرتے تھے، جو رات گئے تک جاری رہا کرتی تھیں۔ ایک بار مجھے بھی اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ ایک محفل میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ چند برس پہلے فالج کا حملہ ان پر ضرور ہوا لیکن انہوں نے دشواریوں کے باوجود اپنا ادبی سفر جاری رکھا اور نیرنگِ خیال کی اشاعت کا سلسلہ بھی ان کے دم واپسیں تک برقرار رہا۔ کئی نسلیں نیرنگ خیال کے توسط سے دنیائے ادب کے سامنے آئیں اور اس جریدے سے طلوع ہونے والے ستارے آج بھی آسمان ادب پر جگمگا رہے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سلطان رشک کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ میں اپنے تعزیتی مضمون کا اختتام ان کی ایک خوبصورت غزل پر کر رہا ہوں:

لکھ رہا ہوں حرفِ حق حرفِ وفا کس کے لیے؟
مانگتا ہوں زندہ رہنے کی دعا کس کے لیے؟

پھول ہیں سب ایک گلشن کے تو پھر تخصیص کیوں
صحنِ گلشن میں یہ زہریلی ہوا کس کے لیے؟

میں تو ناکام محبت ہوں چلو رسوا ہوا
تو بتا ہے تیرا پیمانِ وفا کس کے لیے؟

میں تو اک خواہش کی بھی تکمیل پر قادر نہیں
یہ شکوہ خسروانہ یہ انا کس کے لیے؟

مجھ کو خوش فہمی نہیں ہے، اے ہوا پھر بھی بتا
مضطرب ہے وہ تغافل آشنا کس کے لیے؟

کھو چکا ہے اس کو جب تو خود ہی اے سلطان رشک
اب دھڑکتا ہے دلِ بے مدعا کس کے لیے؟

☆☆☆☆☆

نثار ترابی کی..... بے چین روح

ڈاکٹر نثار ترابی کا شعری مجموعہ ''ہر صدا مسافر ہے'' میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس کی پہلی اشاعت آج سے بیس سال پہلے جب کہ تیسری اشاعت ملٹی میڈیا افیئرز لاہور کے زیرِ اہتمام مئی 2023ء میں ہوئی۔ اردو کے کسی بھی شعری مجموعہ کی تیسری اشاعت اس کی مقبولیت کی خود گواہی دیتی ہے۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ کوئی انسان رحمِ مادر میں فوت ہو جاتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتے ہی راہِ عدم کو روانہ ہوتا ہے اور کوئی سو سال سے بھی زیادہ عمر پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح بہت سی کتابیں تخلیقی عمل کے دوران مر جاتی ہیں۔ کچھ چند دنوں تک منظرِ عام پر رہتی ہیں جبکہ کچھ کتابیں ہزاروں سال سے موجود ہیں۔

ڈاکٹر نثار ترابی کا شعری مجموعہ اب بیس سال کا ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی طویل عمر پائے گا۔ اُس کی وجہ یہ نہیں کہ ڈاکٹر ترابی علم و ادب کے مرکز اسلام آباد، راولپنڈی میں رہتے ہیں بل کہ ان کی شاعری اس قدر فکر انگیز ہے کہ وہ ادبی دنیا میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔ جب کوئی ادب پارہ اہلِ نظر اور اہلِ خرد کی نظر میں اپنا منفرد مقام حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ زندہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کا ادبی مقام بہت اونچا ہے۔ یہ نثر نگار، محقق، سکالر اور صاحبِ رائے ہیں۔ سب کچھ ہونے کے باوجود ان میں کمال درجہ کا عجز و انکسار ہے۔ یہ اخلاق کا پیکر ہیں۔ بہت ہی مہذب اور انسان دوست ہیں۔ ان کی شیریں گفتگو کا یہ عالم ہے کہ..... وہ کہیں اور سنا کرے کوئی..... گفتگو کرتے وقت دوسروں کو یہ بالکل احساس نہیں ہونے دیتے کہ مخاطب سے ان کا علم بہتر ہے۔ رکھ رکھاؤ ان کی گٹھلی میں بند ہے۔ علم و ادب کے شعبے میں ان کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ ادب میں اپنا منفرد مقام بنانے کے باوجود ان میں پھل دار درخت کی مانند جھکاؤ ہے جو عجز اور انکساری کا ثبوت ہے۔ ان کا یہ شعر میری اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ.....

ہم ہیں درویش اِسی خاک میں رہنے والے
ہم سِتارے نہیں افلاک میں رہنے والے

یعقوب نظامی

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا..... کتنی معصومیت عجز اور انکساری میں اپنے آپ کو خاک نشین ہی رہنے دیا۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ اپنا مقام افلاک سے بھی آگے بتاتا۔ ایسے مصنوعی لوگ ہمارے معاشرے میں تھوک کے بھاؤ ملتے ہیں کہ نظر آتے ہیں۔ ان کے برعکس ڈاکٹر نثار ترابی میں کمال کا عجز اور انکسار ہے۔ علمی رویّوں کے حوالے سے یہ بخیل نہیں ہیں کہ دریا دل واقع ہوئے ہیں۔ سوشل میڈیا کے دور میں شعراء کی ایک بڑی تعداد کا کلام ہر روز پڑھنے کو ملتا ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے مجھے ماہرینِ معاشیات کی یہ بات یاد آتی ہے کہ مارکیٹ میں جتنا بھی زیادہ مال ہوگا اُس کی قدر و قیمت اتنی ہی گر جائے گی۔ اس وقت مارکیٹ میں شاعری کی بہتات نے ماہرینِ معاشیات کی اس بات کو سچ ثابت کیا ہے..... شاعری کا معیار دن بدن گرتا جارہا ہے۔ بے وزن بے ڈھنگے شعر پڑھ کر دکھ ہوتا ہے..... لیکن شاعروں کے اس ہجوم میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں..... جن میں ایک ڈاکٹر نثار ترابی بھی ہیں۔ ترابی صاحب شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ مختصر ہے۔ مرزا غالب کا ایک ہی چھوٹا سا دیوان ہے جو گذشتہ دو سو سال سے اردو ادب پر حکمرانی کر رہا ہے اور جب تک اردو زبان زندہ ہے غالب کی حکمرانی سب پر غالب رہے گی۔ ڈاکٹر ترابی کل وقتی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب نظر اور صاحب اسلوب نقاد اور محقق بھی ہیں۔ کچھ یہی سبب ہے کہ فنی لحاظ سے ان کی شاعری پورے معیار پر اُترتی ہے۔ وسیع المطالعہ ہیں۔ جس کی جھلک ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔

میں شاعر نہیں۔ تاریخ و ادب کا طالب علم ہوں۔ سیاحت میرا مشغلہ ہے۔ میں نے "ہر صدا مسافر ہے" کو ایک مسافر، ایک سیاح کی نظر سے بھی پڑھا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ بے چین اور بے قرار روح صرف مجھ میں ہی نہیں جو مجھے ہر وقت سیاحت پر جانے کے لئے مجبور کرتی ہے بل کہ ڈاکٹر نثار ترابی کے اندر بھی ایک سیاح اور ایک مسافر کی بے چین روح تڑپتی ہے۔ یہ بات میں دوستی نبھانے کی خاطر نہیں لکھ رہا ہوں بل کہ ڈاکٹر نثار ترابی کے مجموعہ "ہر صدا مسافر ہے" کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ مجموعہ میں شامل غزل کا پہلا شعر ہی مسافر سے شروع ہوتا ہے اور پھر سفر، مسافر کے موضوع پر ایک نہیں کئی شعر آپ کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ آیئے میرے ساتھ آپ بھی اُن اشعار سے لطف اٹھائیں.....

یہ جو آنکھ بستی میں رت جگا مُسافر ہے
خواب تو نہیں لیکن خواب سا مُسافر ہے

سفر میں اپنے حصے کی مسافت یاد رہتی ہے
کہیں آباد ہونے پر بھی ہجرت یاد رہتی ہے

سمندر کا سفر ہو یا سفر ہو وہ خلاؤں کا
مرے پانو میں رہتی ہے سدا زنجیر مٹی کی

نجانے کون سے خوابوں کے امکاں ساتھ لائے گی
یہی جو اِک سفر میں ہے نئی تعبیر مٹی کی

چہار سمت ستارے سفر میں رہتے ہیں
مدار شب کا مقدر بدل بھی سکتا ہے

وگرنہ ضو نہ ستاروں کی گود میں رہتی
سفر کوئی تو رہ آسماں میں باقی ہے

کبھی ہمزاد بھی تو ہمسفر اپنا نہیں ہوتا
ہمیشہ ساتھ رہتا ہے مگر اپنا نہیں ہوتا

دل میں سفر کا خوف بسا تھا تو پھر نثار
اُفتاد کیا پڑی تھی کہ گھر سے نکل گئے

جسے نثار ثرابی طلب ہو منزل کی
سفر میں رہتا ہے وہ درمیاں نہیں رُکتا

جن کو بچپن سے ہو روزی کے سفر پر جانا
اُن کے آنگن میں غُبارے نہیں دیکھے جاتے

کسی سخن پہ بھی بابِ صدا نہیں کُھلتا
یہ کس جہاں کا سفر ہے ذرا نہیں کُھلتا

منزلیں کبھی اس کے ہم قدم نہیں ہوتیں
ساتھ ساتھ چل کے بھی راستا مسافر ہے

بے نام منزلوں کے سفر لکھ دیئے گئے
سو چل پڑے اُدھر کو، جدھر لکھ دیئے گئے

ورد کی لہر تو کرتی ہے سفر صدیوں کا
جسم پہ وقت کا اک وار بہت ہوتا ہے

کس دشتِ بے نوا سے پکارا نہیں گیا
آواز کے سفر پہ تو ہارا نہیں گیا

بدلتی رُت کے مسافر! ذرا سی دیر ٹھہر
میں موسموں کو تری راہ سے گزاروں گا

بے وجہ ٹھہرتے نہیں رستے میں کہیں بھی
بے نام مسافت کی تمنا نہیں کرتے

عمر صدیوں کی جب مسافت ہو
ساتھ دیتی ہے اک اڑان کہاں

وہ گھاؤ بخشے ہیں پچھلی مسافرت نے ہمیں
کہ خوف کھانے لگے ہیں نئے سفر سے ہم

ہر طرف خواب کے قافلے
ہمسفر آب جُو اور تُو

ایک سیاح کی حیثیت سے میں نے اُن اشعار کا ذکر کیا ہے جن میں سفر کے موضوع کو باندھا گیا ہے۔ ان اشعار پر اگر غور کریں تو انھوں نے ایک ہی موضوع پر کئی شعر لکھے اور ہر شعر میں سفر اور مسافر کے لفظ کو نئے انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہ ہنرمندی صرف اُسی شاعر میں ہو سکتی ہے جو استاد شاعر ہو۔ میرے دوست میرے ساتھی اور محسن ڈاکٹر نثار ثرابی جو استاد اور ادیب تو کمال کے ہیں ہی لیکن اپنے شائستہ شخصی رویوں کے باوصف بھی علم و ادب کے وسیع حلقوں میں ہر دل عزیز ہیں۔

آخر میں "ہر صدا مسافر ہے" میں شامل "پرائڈ آف پرفارمنس" ممتاز شاعر سرفراز شاہد کی ایک تحسینی نظم کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو نثار ثرابی کے سفر کے بنیادی استعارے کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں.....

ساتھ دے نہیں پائے بعض ہم سفر اُس کے
وہ سخن کے رستے کا تیز پا مُسافر ہے

فلسفہ ثرابی کے شعر سے یہی نکلا
ابتدا مُسافر ہے ، انتہا مِسافر ہے

☆☆☆☆☆

محمد نصیر زندہ جدید رباعی کا کوزہ گر

شاعری وصفِ پیمبری ہے، اپنی ذات کا وجدان پائے بغیر قافیہ کاری تو کی جا سکتی ہے، مگر بلند پایہ مضمون، یا شعری جمالیات سے بھرپور کوئی مصرع نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی تخلیق کار اپنی ذات کا ہی سراغ پا لے تو اسے کامیابی کی دلیل کہا جائے گا مگر محمد نصیر زندہ، جنھوں نے اپنے شعری مجموعہ کا نام ''میرا دوسرا وجود'' رکھا ہے، نے اپنی ذات کا وجدان پا لیا ہے، انھوں نے بڑی مہارت سے اپنے اندر کے شاعر کو پورے قد و قامت کے ساتھ زندہ رکھا ہوا ہے۔ ان کا تخلص اس پر معتبر دلیل بھی ہے۔ یہ ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے ان کی مہارت اور استادانہ چابکدستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا نام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ محمد نصیر زندہ اپنی ذات کا گیان حاصل کر کے ذات سے آگے کا سفر شروع کر چکے ہیں۔ شعر کہنا کوئی میکینکل عمل نہیں۔ شعر کہنا سیکھا نہیں جا سکتا بلکہ انسان کو جب شعر کہنے کی خداداد صلاحیت کا ادارک ہو جائے تو محنت و ریاضت سے اس وصف کو نکھارا ضرور جا سکتا ہے۔ شاعری کسبی عمل نہیں بلکہ الہامی کیفیت کے دوران کشید کردہ دُرِ معانی کی موزوں ترتیب ہی شعر کو شاعری کے کسی قابلِ ذکر درجے تک رسائی دینے کا حوالہ و ذریعہ ہوتی ہے۔ شاعر کو تلمیذِ یزدان بھی کہا جاتا ہے۔

محمد نصیر زندہ کی رباعیات میں فقیرانہ جلال بھی ہے اور شاعرانہ جمال بھی۔ وہ اپنی رباعی میں بلند مضامین، نئے خیالات کو تیکھے اور تیز دھار استعاراتی و تشبیہاتی سامان سے سجانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے فکری وجدان سے آشنا اس بندۂ خدا نے فارسی، عربی اور اردو اساتذہ کے کلاسیکی کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنی ریاضت کو فن کے چرخے پر کاتنا شروع کر دیا۔ ''میرا دوسرا وجود'' سے ماقبل محمد نصیر زندہ رباعی پر ''نقشِ تحیر، عرشِ سخن، نقدِ آرزو، اور حل من ناصر ینصرنا'' لکھ کر صاحبانِ علم و ہنر سے سندِ کلام لے چکے ہیں۔ اس کتاب میں زندہ کی غزلیں بھی شامل ہیں، جو انھوں نے پیر

طاہر یاسین طاہر

صاحب آف گولڑہ شریف سید شمس گیلانی کے کہنے پر کہی ہیں۔ محمد نصیر زندہ رباعی کا وہ جادوئی شاعر ہے جس کا فکری پرندہ روح الامین کا ہم سفر رہتا ہے۔ان کی ایک رباعی دیکھیے،

گرد اڑ کے مری دیدہ اختر میں پڑی
سخت ابتری افلاک کے لشکر میں پڑی

پوشاک سمندر کی پہن لی میں نے
پھونک ایسی حباب کاسہ سر میں پڑی

.....

اردو رباعی میں ایسا انوکھا اور جاندار مضمون کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہی نہیں بلکہ زندہ نے کربلا کو جس زاویہ فکر سے دیکھا اور عالم انسانیت کو کربلائی ضرورت کا احساس دلایا اس کی تعریف نہ کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ کربلائی استعارے اور کربلا کے حوالے سے زندہ کی رباعیات کا اسلوب منفرد اور اثر پذیر ہے۔اس سے قبل ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ رباعی ہے کیا؟ اور رباعی مقبول و نامقبول صنف کے حوالے سے ناقدینِ ادب کے حجرہ میں کتنی جگہ پاتی ہے۔

رباعی ربع سے ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی اور قطعہ ہر دو کو چار مصرعوں پر مشتمل مختصر نظم کہہ سکتے ہیں مگر دونوں کی ساخت اور عروضی پابندیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ رباعی کے مخصوص چوبیس اوزان ہیں جو سب کے سب بحر ہزج سے ہیں۔ رباعی کے 24 اوزان کا استخراج روایتی طور پر بحر ہزج سے کیا گیا ہے۔ان میں سے 12 شجرہ اخرب اور 12 شجرہ اخرم سے تعلق رکھتے ہیں۔ان دونوں شجروں میں بحرِ ہزج کے رکن اصلی کے کل 10 فروع استعمال ہوتے ہیں۔ مفعول سے شروع ہونے والے اوزان شجرہ اخرب کے ہیں جبکہ مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان شجرہ اخرم سے ہیں۔ رباعی کا مقبول ترین وزن "لاحول ولاقوۃ الّا باللہ" ہے۔ان ہی چوبیس اوزان میں سے رباعی کے چار مصرعے موزوں کیے جاتے ہیں۔یہاں یہ بات روا ہے مختلف اوزان میں رباعی کہی جاسکتی ہے۔

اس کی مثال مرزا دبیر کی یہ رباعی ہے:

آدم نے شرف محرِ بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گھر سے پایا

دو میم محمد سے جہاں روشن ہے
مضموں یہ دلِ شمس و قمر نے پایا

.....

میرا مقصود رباعی کے اوزان پر بحث کرنا نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہنا ہے کہ عروضی اعتبار سے رباعی مشکل صنفِ سخن ہے،جس کے باعث اردو اساتذہ اس سے گریزاں رہے ہیں۔ غالب جیسے استاد نے رباعی کے تیسرے مصرع میں ٹھوکر کھائی۔ علامہ اقبال کی جن دو بیتیوں کو رباعیات کے عنوان سے شائع کیا گیا

ہے وہ اپنی ساخت اور مضامین کے اعتبار سے رباعیات نہیں بلکہ دو بیتیاں ہیں۔

رباعیات میں فنی و عروضی مہارت ہی کافی نہیں بلکہ خیال آفرینی اور سلاست و روانی کو برقرار رکھنا ہی اصل شاعری ہے۔ اگر رباعی شعری جمال سے آراستہ نہیں بلکہ صرف عروضی سانچے میں ڈھال کر تیار کی گئی ہے تو الفاظ اپنے اوپر ہونے والے جبر کا اظہار کرتے نظر آئیں گے۔ لہٰذا اسے یوں نہ سمجھا جائے کہ چوبیس اوزان کو یاد کر لینے سے رباعی کہنا آجاتی ہے۔ ایسا بالکل نہیں۔ شعری جمال اور زور بیاں کے بغیر عروضی سانچے میں ڈھلے ہوئے چار مصرعے طبع لطیف پر گراں گذریں گے اور ذہین قاری کی بصارت پر بوجھ بنیں گے۔

رباعی اپنی ساخت میں چوبیس پچیس لفظوں کی آئینہ کاری ہے جس میں شاعر نے مہارت سے اپنے خیالات کا عکس دکھانا ہوتا ہے۔ یہ عکس اگر بلند و آسماں نشیں مضامین کا پیرہن نہ پہن سکے تو اس مشق سخن کو قافیہ کاری کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ رباعی فارسی شعرا کی ایجاد ہے اور انھوں نے ہی اس میں ایسے ایسے مضامین تراشے کہ دنیا کے ادب عالیہ میں اپنا مقام بنایا۔ عمر خیام کی یہ رباعی مثال کے طور پر پیش ہے:

در دہر کسے بہ کل عذارے نہ رسید
تا بر دلش از زمانہ خارے نہ رسید
در شانہ نگر کہ تا بہ صد شاخ نہ شد
دستش بہ سرے زلف نگارے نہ رسید

.....

غزل، نظم، مثنوی اور مرثیہ میں تو اردو شعرا نے آسمان کا قد ناپا ہے، لیکن یہی شعرا جب رباعی کا فیتہ اٹھا کر میدان سخن میں آتے ہیں تو ہمیں وہ چاشنی، وہ لوچ اور لہک نظر نہیں آتی جو فارسی شعرا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو ہمیں یہی لگتا ہے کہ اساتذہ صرف اور صرف اپنی مہارت کے اظہار کے لیے گاہے گاہے رباعی کہہ لیا کرتے تھے۔

مثلاً غالب نے بہادر شاہ ظفر کی جانب سے بھیجی گئی دال پر ایک رباعی کہہ دی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے اساتذہ کے نزدیک رباعی کی کیا حیثیت تھی۔ حالانکہ غالب اور دیگر اساتذہ اردو کو رباعی پر بھی اتنی محنت کرنی چاہیے تھی جتنی انھوں نے غزل پر کی۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

.....

اب ہم زندہ کی رباعیات میں خیال آفرینی دیکھتے ہیں۔ زندہ اپنے اشعار میں دار، آئینہ، شمس و قمر کو جب استعارہ کے طور

پر لیتے ہیں تو حیرت افروز مضامین کو خیال و ہنر کا پیرہن عطا کرتے ہیں، کردار کی عظمت اور سچ بات کے لیے دار پر جھول جانے کو انسانی وقار کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہ رباعی دیکھیے:

سر عظمتِ کردار سے ہوتا ہے بلند
سر جرأتِ انکار سے ہوتا ہے بلند
سر طرّہ و دستار کا محتاج نہیں
سردار کا سر، دار سے ہوتا ہے بلند

.....

اردو رباعی کا مجموعی میلان پند و نصائح، حکمت اور وحدالوجودی مضامین ہی رہے ہیں۔ محمد نصیر زندہ بھی ان ہی مضامین کو نئے زاویے اور نئے پہلوؤں سے نہ صرف آشکار کر رہے ہیں بلکہ نئے مضامین بھی پیدا کیے۔ جوان کی کامرانی کی بڑی دلیل ہے۔

رباعی کا یہ کوزہ گر اپنے خیالات کو جب فن اور مضامین کے چاک پر گھماتا ہے تو ایک تازہ کار رباعی ہم سب سے داد و تحسین کی مستحق نظر آتی ہے۔ لیکن صد حیف کہ جدید رباعی کا کوزہ گر عہدِ کورچشماں میں آئینہ کاری اور آئینہ فروشی کر رہا ہے۔ محمد نصیر زندہ کی چند رباعیات دیکھیے:

کیا حسنِ بے مثال پہنا ہوا ہے
گلشن نے مرا جمال پہنا ہوا ہے
اس کی خوشبو سے میری سوچ اگتی ہے
یہ گل نے میرا خیال پہنا ہوا ہے

.....

خورشید سوار اِسم کے پار اترا
افلاک شکن طلسم کے پار اترا
طاؤس کے پیرہن تھے آواز کے رنگ
میں ایک دن اپنے جسم کے پار اترا

.....

چہرے وہ کئی تنگ پہن لیتا ہے
آئینہ کبھی سنگ پہن لیتا ہے
میں اس سے باہر جو نکلنا چاہوں
وہ شوخ مرا رنگ پہن لیتا ہے

.....

محمد نصیر زندہ رباعی کے پہلے مصرع میں قاری کو حیرت میں ڈالتے ہیں، دوسرے مصرعے میں اپنے خیال کو ارتقا دیتے ہیں، تیسرے مصرعے میں خیال کا اظہاریہ عشوہ گری دکھاتا ہے اور چوتھے مصرع میں ڈرامائی نتیجہ دیتے ہیں۔ ایسا جو قاری کو مزید حیرت و سرخوشی میں ڈال دیتا ہے۔ یہی خوبی ان کو رباعی نگاری میں ممتاز کرتی ہے۔ کربلا، امام حسین علیہ السلام اور حضرت علی علیہ السلام کے مناقب کے حوالے سے زندہ نے جو رباعیات کہی ہیں وہ ادب میں نئے در وا کرتی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی منقبت میں کہی گئی یہ دو رباعیات دیکھیے:

قفلِ راز و نیاز کھل جائے گا
مے خانہ عرشِ ناز کھل جائے گا

جرعہ نہ پلا خمِ علی کا ساقی
بندے پہ خدا کا راز کھل جائے گا

مرنے پہ مری برات رکھ دی اس نے
تشنہ نگہِ حیات رکھ دی اس نے

میں نے کہا اسرارِ علی مجھ کو بتا
سر پر مرے کائنات رکھ دی اس نے

.....

سرمستی میں کہی ہوئی یہ رباعیات قاری کے دل و دماغ پر کسی دوسرے فکری و معنوی جہان کا در وا کرتی ہیں۔ اردو ادب میں کربلا کا استعارہ ہر شاعر نے اپنے اپنے ذوق اور رنگ سے استعمال کیا ہے۔ کربلا کے حوالے سے میر انیس اور مرزا دبیر نے شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جسے شکار نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود اردو شاعری میں ایسے کئی شعر مل جاتے ہیں جو کربلا کے کسی نئے زاویے اور پہلو کو روشن کر رہے ہوتے ہیں۔ جوش کی رباعی نے بہت شہرت حاصل کی، بالخصوص آخری دو مصرعے زبان زدِ عام ہیں،

کیا صرف مسلماں کے پیارے ہیں حسین
چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسین

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

اب میں آپ کو کربلا، امام حسین علیہ السلام اور آپ کے جانثاروں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے محمد نصیر زندہ نے جو رباعیات کہی ہیں ان کی جھلک دکھاتا ہوں۔ بلاشبہ یہ رباعیات رثائی ادب کا جاندار حوالہ ثابت ہوں گی:

تجدیدِ کہن فنا کی مٹی میں ہے
تعمیرِ نو قضا کی مٹی میں ہے

وا ہوں گے نہاں خانہ تخلیق کے در
آدم ابھی کربلا کی مٹی میں ہے

.....

آدم ابھی کربلا کی مٹی میں ہے، یہ زاویہ فکر بالکل نیا، اور اچھوتا ہے مگر ایمان و حیرت افروز بھی ہے۔ ایسا خیال بغیر عطا کے ممکن نہیں۔

زندہ پر شہرِ علم در کی ایسی ایسی عطا ہے کہ اس پر وہ جتنا بھی شکر کریں کم ہی کم ہے۔

حضرت اصغر علیہ السلام، لشکرِ امام حسین علیہ السلام کے سب سے کم سن سپاہی ہیں، آپ کی شہادت کو ایسا خراج شاید ہی اردو ادب میں ملے، اس رباعی کی تعریف سے الفاظ قاصر ہیں:

قلزم اذنِ گہر فشانی مانگے
موجِ دریا تابِ روانی مانگے

مقتل میں رقصِ آرزو جاری ہے
موت اصغرِ بے شیر سے پانی مانگے

موت اصغر بے شیر سے پانی مانگے"، یہ فتح و نصرت کا ایسا فخر آفریں ناز ہے جس کا جواب نہیں۔

جن خیالات اور مضامین کو محمد نصیر زندہ قلم بند کر رہے ہیں اس کے لیے ریاضت ہی نہیں وسیع مطالعہ اور خلعتِ فقری پہننا بھی ضروری ہے کیونکہ رباعی کا مزاج اور پیمانہ ہی ایسا ہے کہ اس میں صوفیانہ اور آفاقی مضامین ہی سماتے ہیں۔ اردو ادب میں بہت کم رباعیات ایسی ہیں جو عشقیہ یا غزل کے مضامین دامن گیر کیے ہوئے ہوں اور اپنا شعری جمال بھی سنبھال پائی ہوں۔ زندہ کی یہ رباعی دیکھیے، جس میں محاورے کے استعمال نے فی چابکدستی کے ساتھ ساتھ شاعر کی مشاہداتی قوت کا بھی رنگ دکھایا ہے۔

چوٹی میں موتیا سجایا اس نے
اونچی ایڑی سے قد بڑھایا اس نے
اک حشر سرِ بزم اٹھانے کے لیے
زور ایڑی چوٹی کا لگایا اس نے

خیال کا ارتقا دیکھیے، اس رباعی میں اور پھر اس کا ڈرامائی نتیجہ۔ چوٹی بھی بنائی، اس پہ موتیا بھی سجایا، اور پھر سرو قامت نظر آنے کے لیے مزید سامان یہ کیا کہ اونچی ایڑی والا جوتا بھی پہن لیا۔ حشر سامانی نے قیامت جگانے کے لیے جو اہتمام کیا اس کو چوتھے مصرعے میں شاعر نے جس خوبصورتی سے ادا کیا ہے، یہ شعری مقام طویل ریاضت اور شعری جمالیات سے گہری شناسائی کا متقاضی ہے۔

جدید رباعی کا کوزہ گر اپنے فن کے چاک پر بلند مضامین و خیال کے رباعیانہ ظروف اٹھائے صدائیں دے رہا ہے، لیکن خریدار کم ہیں۔ اس خوش نصیب شاعر کی کم نصیبی یہ ہے کہ جب یہ اپنی جنسِ ہنر بازار لایا تو خریدار کی دلچسپی اعلیٰ مضامین و خیال کے بجائے انتہائی سطحی ادبی گرد و غبار تک رہ گئی ہے۔ اس ادبی دھند اور غبار میں ادبی خریدار کی آنکھ غبار کے اس پار نہیں دیکھ پا رہی ہے۔ اسے ہر طرف صرف ادبی گرد، ہی نظر آتی ہے اور گرد کو ہی خریدار اپنے ذوق کا سائبان سمجھنے لگا ہے۔ مجھے مگر یقین ہے کہ یہ گرد بہت جلد بیٹھ جائے گی۔ اس ادبی گرد کے اُس پار جدید رباعی کا کوزہ گر اپنے بلند قامت، خوش پوش و خوش خیال مضامین کے رباعیانہ ظروف لیے فاتحانہ مسکراہٹ سے ورود کر رہا ہوگا۔

میزان پر اک ایک گہر تولا ہے
ہر بول قلم کی نوک پر بولا ہے

میں نے درِ گنجینۂ اسرارِ سخن
اسمائے علی کے زور سے کھولا ہے

☆☆☆☆☆☆

درمیر پر گدائی کرنے والا شاعر.....مبشر سعید

محبت وا لہانہ، اور رقص درویشی کے ساتھ جون ایلیا کی بے نیازی اور ساغر صدیقی کی سرمستی کے رنگوں کو سمیٹ کر مبشر سعید ملتان سے ساہیوال کی حدود میں کچھ عرصہ قبل داخل ہوا۔ رنگ و نسل کے سارے فرق مٹا کر ہر آنے والے کو اپنی لمبی گھنی زلفوں کے نیچے ٹھہرا لیتا۔ گھنی چھاؤں میں دھوپ اوپر سے چمک کے چلی جاتی۔ مبشر سعید نے بہت کم وقت میں شہر میں اپنی ایک الگ شناخت بنا لی۔ مبشر سعید اپنے ہم عصروں میں بے تکلف سینئر کی محفل میں باادب یہ عادت اس کی پیدائشی اخلاقی تربیت کی غمازی کرتی ہے۔ مبشر سعید کا پہلا شعری مجموعہ کچھ برس پہلے،، خواب گاہ میں ریت،، کے نام سے منظر عام پر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شعری مجموعہ نے اس کی شناخت کا وسیلہ بنتے ہوئے شہرت کی تمام منازل طے کیں،،خواب سراء کے بھید،، مبشر سعید کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو اسی برس سخن سرا پبلی کیشن ملتان سے شائع ہوا ہے۔ خوب سرا کے بھید مبشر سعید کے اندر بپا محفلوں میں کی جانے والی شاعری کا ایک انتخاب ہے۔ مبشر سعید جینوئن شاعر ہے۔ سو اس کی شاعری میں محسوسات و جذبات کی نمائندگی کھل کر ہوتی ہے۔ اس کی زیادہ تر غزلیں ایسی ہیں۔ کہ جن میں ایک نہیں کئی اشعار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ عنصر مجھے جن جن شعرا میں ملا ہے۔ انھوں نے تیزی سے یا دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے سخن کی ملکہ کو تسخر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آیئے شعری مجموعہ میں شامل کچھ غزلوں کے اشعار پڑھتے ہیں۔

خود کو اظہار میں لانے کے لئے ہوتے ہیں
شعر کب نام کمانے کے لئے ہوتے ہیں

اندھیری رات کا دیا
ہوا نے کیوں بجھا دیا

تم نے خاموشی کو سنا ہی نہیں
میں نے تم کو بہت پکارا ہے

حیرانی نے آنکھیں کھو لیں
جب بھی دیکھا شام کا چہرہ

کسی منظر نہ کسی جسم کی عریانی سے
آنکھ حیران ہے خوابوں کی فراوانی سے

اے فوائد مجھے دنیا کے بتانے والے
شاعری کم تو نہیں تخت سلیمانی سے

خالق آرزو

حیرانی کو زنجیر کرنے کا ہنر مبشر سعید کو ہی حاصل ہے۔ حیرانی جب روشن پیشانی کو چومتی ہے۔ تو وجود کے باطن تک حصار مکمل کر لیتی ہے۔ مبشر سعید کا کھلکھلاتا ہوا چہرہ سلسلہ روزگار کی پتی دوپہروں میں سفر کرتا رہا ہے۔ گویا ایک جہد مسلسل زندگی جس کی متقاضی ہے۔ دراز گیسو وضع دار مبشر سعید کی شاعری کہکشاؤں کی صورت کئی جہان سمیٹے ہوئے ہے۔ کہیں کتھارسس ہے۔ کہیں ذاتی تجربات، محسوسات کہیں معرفت ہے۔ تو کہیں روحانی جذبات، ابھی بیکرانی کا سفر جاری ہے۔ اور اس نے کہیں ٹھہراؤ نہیں کیا، سیمابی کیفت مبشر سعید کی شخصیت کی طرح اس کی شاعری کا بھی نمایاں حصہ نظر آتی ہے ---- معرفت کے رنگ دکھاتے ہوئے کچھ اشعار:

رنگ بدلا نہ ہی چہرے پہ ملال آیا تھا
میں سمندر کی مسافت سے نڈھال آیا تھا

رقص کرتے ہوئے پاؤں کیے زخمی سب نے
مدتوں بعد فقیروں کو جلال آیا تھا

آنے لگا ہے لطف سراسر دھمال میں
رکھتا ہوں خود کو برابر دھمال میں

ذہن کے طاق میں رکھی نشانی تیری
تھک گیا دیکھ کے تصویر پرانی تیری

.....

یہ پردہ اٹھنے کا عمل معرفت سے عشق ہے۔ یہاں لمحہ بھر ٹھہرنے مڑ کے دیکھنے کا عمل پتھر کر دیتا ہے۔ گماں کا استعارہ یقین میں ڈھلتا ہے۔ خدا سے کی ہوئی بات پوری ہوتی ہے۔ وصل کا لمحہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور پھر شاعر یوں کہہ اٹھتا ہے۔

شعر ہونے لگے سہولت سے
جب در میر پر گدائی کی

صبر بویا تھا عجز کاٹا ہے
عمر بھر یہی کمائی کی

دل آنگن کو کھول دیا، چپ رہ کر سب بول دیا
مدت بعد کسی کو ہم نے خود سے خود ملوایا تھا

.....

مبشر سعید ایک کثیر الجہت شخصیت ہے۔ نئی انداز، وسعت مطالعہ، عمیق فطری، اور غیر معمولی صلاحتیں، انساں کو شہرت اور سربلندی کی رفعتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ عزت دراصل کسی کام کو انتہائی خوبصورتی سے نبھانے کے بعد ملنے والے اعزاز کا نام ہے۔ محنت کے بغیر انسان مشکل سے بن پاتا ہے۔ مبشر سعید ایک عہد ساز شخصیت کے طور پر ہمارے عہد میں موجود ہیں۔ ان کی ذات ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ مزید اشعار:

ستم تو یہ کہ ہزاروں کی بھیڑ میں مجھ کو
کہیں کہیں کوئی اپنا دکھائی دیتا ہے

سانس لیتے ہوئے اجسام تو لاکھوں ہوں گے
ذہن ملتا ہے مرا شہر میں دو چار کے ساتھ

.....

اب آخر میں ان کی ایک غزل کے اشعار پڑھیئے اور اپنا سر دھنیے:

ہم اگر تیرے خد و خال بنانے لگ جائیں
صرف آنکھوں پہ کئی ایک زمانے لگ جائیں

میں اگر پھول کی پتی پہ تیرا نام لکھوں
تتلیاں اڑ کے ترے نام پہ آنے لگ جائیں

ہم اگر وجد میں آئیں تو زمانے کو سعید
کبھی غزلیں تو کبھی خواب سنانے لگ جائیں

☆☆☆☆☆

اقبال راہی کی ادبی وصحافتی خدمات نصف صدی کا قصہ

شہرِ لاہور کی ادبی، ثقافتی اور صحافتی فضا اقبال راہی کے نام کے بغیر ادھوری اور بے رنگ تصور کی جاتی ہیں۔ ادب وصحافت کے میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے کئی کمالات دکھائے ہیں، جن کا ادبی حلقوں میں برملا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اقبال راہی کا شمار ایسے قلم کاروں میں ہوتا ہیں جنھوں نے بنا کسی غرض اور لالچ کے بے لوث اپنی خدمات ادب وصحافت کے لیے صرف کیں۔ اقبال راہی ایک قادر الکلام شاعر، ادیب، صحافی اور بحیثیت ایک نقاد کی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ ۵ جنوری ۱۹۴۵ کو بھارت کے شہر اتر پردیش ضلع سہارنپور کی ایک علمی وادبی شخصیت اشفاق احمد کے ہاں پیدا ہوئے، دو سال کی کم عمری میں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان کے شہر لاہور کے تاریخی بازار انارکلی میں کرائے کے مکان میں آباد ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دمری ہائی سکول پیسہ اخبار انارکلی سے حاصل کی جبکہ ایف اے گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور سے کیا جس کے بعد معاشی حالات سنگین ہونے کے باعث ایک سرکاری ادارے محکمہ فائر بریگیڈ میں ملازمت اختیار کی۔ اس دوران انھوں نے اپنے ادبی ذوق شوق میں کسی صورت کمی نہ آنے دی۔ چند برسوں تک ملازمت سے فراغت پاتے ہوئے شعبہ صحافت کو اپنا ذریعے معاش بناتے ہوئے جریدہ ''قہقہہ''، ''نیا پیام'' فلمی میگزین کے ڈائریکٹرز کی مجلس ادارت سے منسلک رہے، شورش کاشمیری کے مقبول اخبار ''چٹان'' میں بھی بطور مدیر معاون کام کرتے رہے۔ روزنامہ ''کوہستان'' میں حالاتِ حاضرہ سے متعلق ان کے قطعات شائع ہوتے رہے اور یہی سلسلہ کئی برسوں

صدام ساگر

سے وہ ''اوصاف'' اخبار میں بھی باقاعدگی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے یہ قطعات سیاسی اور غیر سیاسی تجزیات کی عکاسی کرتے ہوئے ہر دن کی تازہ خبر کی طرح قارئین کو تازہ دم رکھتے ہیں۔

اقبال راہی خالصتاً لاہوری ہے، وہ لاہوریوں کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس تاریخی شہر کی محبت میں تو کبھی اس زرخیز مٹی پہ قیام کرنے والے بزرگانِ دین کی عقیدت میں اشعار لکھتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۱ میں کیا اور معروف اُستاد شاعر حضرت احسان دانش کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے کئی برس تک ان کی زیرِ نگرانی مشقِ سخن جاری رکھنے کا سفر طے کیا۔ اس بات کا ثبوت ان کے گھر جائیں تو ہمیں ایک دیوار پر فلمی اداکاروں اور فنکاروں کی نایاب تصاویروں کے علاوہ دوسری دیوار پر ادبی شخصیات کے ساتھ ان کی یادگار تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں - جن میں احسان دانش، مہدی حسن، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروین شاکر، شہزاد احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ذوقی مظفر نگری اور بہت سی نامور شخصیات کی یادیں دیوار پر سجی ہوئی اُداس طبیعت کے سبب احمد فراز کے اس شعر کے مصداق سبھی تصویریں دیوار کے بجائے دل کو اچھی لگی ہیں۔

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

.....

اقبال راہی ایک درویش طبع، صاف گو، خوش فکر، خوش مزاج، وفادار اور ادب دوست آدمی ہے، ان کی ادبی خدمات نصف صدی پر محیط ہے، ان کی تصانیف میں ''زندہ حروف''، ''ہائی الرٹ پاکستان''، ''شیل''، ''پاکستان کا روزنامچہ'' اور ''قطع بُرید'' شامل ہیں۔ معروف شاعر رئیس امروہوی کے بعد قطعہ نگاری کی فہرست اقبال راہی کے بنا نامکمل ہے۔ موجودہ عہد میں قطعات پر مشتمل تین شعری مجموعوں کا ریکارڈ انہی کے پاس ہے۔ اقبال راہی کا مطالعہ بے حد وسیع ہے وہ اپنی قادرالکلامی کی وجہ سے ادبی اور صحافتی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، وہ شاعری کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ نثر نگار کے طور پر بھی مانے جاتے ہیں۔ انہیں قطعہ نگاری کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، سلام، رباعی، غزل، نظم، افسانے اور کالم جیسی اصناف پر دسترس حاصل ہیں۔ ان کا کلام مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں آج بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ ان کا ایک شعر مجھے بڑی شدت سے یاد آرہا ہے کہ:

جب بھی بچھڑے ہوئے ساتھی مجھے یاد آتے ہیں
میری آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں اکثر آنسو

.....

اقبال راہی موجودہ معاشرتی اور ہنگامی کیفیتوں میں جکڑے ہوئے واقعات کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنے اشعار کی صورت میں بیان کرتے ہیں، ان کی انفرادی شاعری حالات وواقعات کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اجمل نیازی (مرحوم) کے بقول "اقبال راہی انتہا درجے کا قادرالکلام شاعر ہے، وہ شعر اس روانی سے کہتا ہے کہ اتنی آسانی سے تو ہم باتیں بھی نہیں کر سکتے، آج کل فل البدیہہ بات کا دور نہیں اور یہ بھی ہمارے دور کی محرومیوں میں سے ایک ہے لوگ محنت کرنا بھول گئے ہیں اور تکلیف اٹھانا بے مروتی کے مترادف سمجھتے ہیں جبکہ دکھ سہے بغیر کسی بھی ہنر میں کمال حاصل کرنا ناممکن ہے اتنا جانتا ہوں کہ اقبال راہی اس مقام تک بڑے ہی عذابوں سے گزر کر پہنچا ہے مگر میں نہیں جانتا کہ ان عذابوں کے نام کیا کیا ہیں۔"

کچھ لوگ دنیا کی بھیڑ میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ انہیں اپنے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، لیکن اقبال راہی اپنی ذاتی مصروفیت سے دوسروں کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، وہ ہر صورت میں اپنا درد کو عیاں رکھ کر دوسروں کے چہروں پر تبسم کے پھول کھلانے، دوسروں کے لیے جینے، دوسرے کے کام آنے فرشتہ صفت انسانوں میں سے ایک ہیں۔ وہ امیر آدمی نہیں مگر اس شخص سے زیادہ امیر دنیا میں کون ہوگا کہ جو اپنے لہو میں کمال فن کے خزانے سنبھالے ہوئے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

لئے بغیر جو منزل پہ آئے ہو راہی
تمہارے ساتھ کوئی رہنما نہیں ہے کیا

.....

اقبال راہی، میر، غالب، اقبال، احسان دانش اور انجم رومانی جیسے شاعروں سے متاثر ہے۔ ان کی شاعری میں قطعہ نگاری نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سوچ وفکر کے نئے انداز کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں لطیف جذبوں سے مزین ہے جس میں محبت کی مٹھاس بھی ملتی ہے اور نارسائی کا کرب بھی۔ آج سے کئی برس قبل نوائے وقت اخبار میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "اقبال راہی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کو شعر کہنے کے لئے نہ پرسکون ماحول کی ضرورت ہے اور نہ شعر نازل ہوتے وقت ان پر سنجیدگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے بس وہ تو چلتے پھرتے شعر کہنے کے عادی ہیں۔"

اقبال راہی بہت سے مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں، وہ نظامت کے دوران ہر شاعر کو بلانے سے پہلے فل بدیہہ اُس کا منظوم تعارف کرواتے ہیں یوں اس طرح وہ نظامت کی دنیا میں اپنا منفرد حوالہ رکھتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ آج بھی کسمپرسی اور بیماریوں کے زیرے نظر ہیں۔

ان کو اپنی بیماریاں زیادہ تکلیف نہیں دیتیں جتنی انہیں اولاد کے ہاتھوں دکھ اُٹھانے پڑے۔ ان کا جواں سال بیٹا اور بیٹی تھیلیسیمیا کے موذی مرض کی وجہ سے موت کی نیند سو چکے ہیں ابھی اس درد سے پوری طرح نجات نہیں ملی تھی کہ ان کا ایک اور جوان سال بیٹا فرحان اقبال جو ایک اچھا صاحبِ کتاب شاعر تھا وہ ابھی اسی جان لیوا بیماری کی نظر ہوتے ہوئے مٹی کی چادر اوڑھے ابدی نیند سو گیا۔ جس کی برس ہر پندرہ دسمبر کو آتی ہے اور درد بھرے یادوں کے پھول تازہ کر دیتی ہے۔

غموں کا مارا ہُوا اس جہان سے نکلا
اک اور فرد مرے خاندان سے نکلا

.....

اقبال راہی ایک سفید پوش آدمی ہے جن کی شخصیت اور فن میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں، وہ اُن باہمت لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ آج سے کئی برس پہلے میں نے ان کا ماہنامہ ''سویرا'' میں ایک انٹرویو پڑھا جس میں ان کا ایک جملہ مجھے بہت اچھا لگا کہ ''کتاب اور عورت جب ہاتھ سے نکل جائے تو بازار میں ہی ملتی ہے۔'' اقبال راہی جیسے لوگ دنیا میں بہت خال خال ملتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہاں ادبی ایوارڈز سفارش اور ادبی مقام و مرتبے کے حوالے سے تقسیم کیے جاتے ہیں، راہی صاحب کو ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ وہ ماہنامہ تارکین وطن لاہور کے ادبی گوشے کے مدیر ایک طویل مدت تک رہے۔ ان کی شاعری کا فکری اور فنی جائزہ پہ مقالہ ہمایوں عامر مغل نے منہاج یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر ناصر بلوچ کی زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ اقبال راہی کی سادہ دلی اور درد کی کیفیت کا اندازہ ان کے اس اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

حدِ احساس پر نفرت کی چادر تان آیا ہے
یہ کیسے موڑ پر اس دور کا انسان آیا ہے
مری پہچان اب ان کے حوالے سے نہیں ہوتی
مرے حصے میں یہ کتنا بڑا نقصان آیا ہے

.....

اقبال راہی آج بھی ایک طویل عرصے سے لاہور کی ادبی محافل میں سرگرم عمل ہے، اعتبار ساجد کے مطابق ''وہ زود گو شاعر ہے موقع اور محل کی مناسبت سے شعر کہتے ہیں، نہایت وضع دار اور مخلص انسان ہے اسی لیے لوگ ان سے پیار بھی کرتے ہیں اور ان کی عزت بھی۔'' اقبال راہی کو میں نے ہمیشہ مخلص اور بے لوث پایا ہے دُعا گو ہوں کہ پروردگار انہیں صحتِ کاملہ اور زندگی کی تمام نعمتوں سے سرفراز رکھے، کیوں کہ ایسے لوگ بہت ہمارے درمیان بہت کم رہ گئے ہیں جن سے شہرِ لاہور کی پرانی یادیں وابستہ ہے۔ آخر میں ناصر کاظمی کا خوبصورت خیال:

شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی بطور مزاحیہ شاعر

اردو طنزیہ و مزاحیہ ادب کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ہر دور میں ایسے فن کار اور تخلیق کار میسر آئے جنھوں نے اپنے فنِ ظرافت سے گلستانِ طنز و مزاح کو آباد رکھا۔ اپنی شگفتہ بیانی سے اس چمن زار کو مہکایا اور اپنی رنگینی و رعنائی سے اسے منظر ادب پر قوس و قزاح کے رنگ بکھیرے۔ دورِ جدید میں ان اہم تخلیق کاروں میں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا اصل نام سعید اقبال رانا ہے، جبکہ قلمی نام ڈاکٹر سعید اقبال سعدی ہے۔ ان کی ولادت شیخوپورہ میں طفیل محمد خان کے گھر 22 نومبر 1955 کو ہوئی۔

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کا تعلق شعبہ طب سے ہونے کی وجہ سے زندگی کی تلخی، بے بسی اور درد و غم سے واسطہ پڑنا ان کے لیے معمول کی بات ہے لہٰذا سنجیدہ شاعری میں ان جذبات و احساسات کا بیان ایک عرصے تک ہوتا رہا اور وہ ان کے اظہارِ بیان میں بہت کامیاب رہے۔ اس کامیابی کا ثبوت ان کی سنجیدہ شاعری کی چھ کتب ہیں جو انھوں نے تخلیق کیں۔ اس ادبی سفر کے دوران حساسیت نے کچھ یوں انگڑائی لی کہ سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت فنِ ظرافت کی جانب بھی مائل ہوگئی تو گردو پیش کی بے اعتدالیوں، ناانصافیوں اور عدم توازن کے سبب پردہ ذہن پر مچلتے خیالات کو بغرضِ وضاحت سپردِ قلم کیا اور اپنی شیریں اور شگفتہ بیانی کے عوض داد وصول کی یوں ایک نیا باب مقبولیت کا وا ہوا۔ سنجیدہ شاعری پر ان کی درج ذیل کتب اشاعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے قلب و ذہن میں اپنی جگہ بنا چکی ہیں:

ثوبیہ ارشد

-1	''لغزشِ پا''	(غزلیات)	1986ء
-2	''تہی دامنی''	(ہائیکو)	1987ء
-3	''امراضِ جلد اور توہمات''	(کتابچہ)	1989ء
-4	''امراضِ جلد سے بچاؤ''	(کتابچہ)	1990ء
-5	''امراضِ مخصوصہ اور نوجوان''	(کتابچہ)	1991ء
-6	''ایک شعر کی تلاش میں''	(ایک ہی بحر میں مجموعہ کلام)	1993ء
-7	''گلاب اور طرح کے''	(غزلیات)	1995ء
-8	''کشمکش''	(ایک ہی بحر میں مجموعہ کلام)	1999ء
-9	اگر تم لوٹنا چاہو''	(غزلیات)	2003ء

شعبہ طب سے وابستہ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کا شمار فنِ ظرافت پر مکمل گرفت رکھنے والے ایسے شعرا میں ہوتا ہے جو نہایت سنجیدہ صورت حال کو چٹخارے دار انداز میں بیان کر کے ناگوار اور تلخ حقائق کو بھی قابل قبول اور دلچسپ بنا دیتے ہیں طب کے ساتھ ساتھ ادب کے میدان میں وہ سنجیدہ شاعری کرتے ہیں اس ضمن میں نصف درجن سے زائد کتب کا منظرِ عام پر آنا ان کی مقبولیت اور ان کے کلام کی عوام و خواص میں قبولیت کی سند ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے سنجیدہ شاعری سے ہٹ کر آپ صرف مزاح نگاری کر رہے ہیں اور بیشتر ملکی و غیر ملکی مشاعروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر مشتمل اب تک ان کا پہلا مجموعہ ''مذاق'' کے نام سے 2023ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بن ہاشم پبلی کیشنز، گوجرانوالہ سے شائع کردہ یہ شعری مجموعہ عمدہ کتابت، بہترین اوراق کے 176 صفحات پر مشتمل اپنے اندر شگفتہ شاعری کا ایک جہاں سمیٹے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کے اس شعری مجموعے میں شامل کلام کو جن موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) عورتیں (2) شوہرانہ مذاق (3) مولوی
(4) کرونائی دور (5) میڈیکل مذاق
(6) سیاسی مذاق (7) عید الفطر (8) عید الاضحیٰ
(9) بچگی (10) متفرق قطعات
(11) مزاحیہ نظمیں (12) زعفرانی غزلیں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کو اکیسویں صدی کے مزاح نگاروں کی فہرست میں اہم مقام اس لیے بھی حاصل ہے کہ ان کی طبیعت کی سنجیدگی معائب و عوارض کا ادراک رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں طنز کی نسبت مزاح کا غلبہ ہے۔ وہ مزاح میں بہت گہری بات کہہ جاتے ہیں جو قارئین کے لیے پیغام اور لمحہ

فکر یہ بن جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، کوئی کجی، کوتاہی، تضاد اور عدم توازن ہو اس کا بیان ظریفانہ مگر دوٹوک ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ میاں بیوی کی نوک جھونک ہو، مہنگائی ہو، فیشن یا بیوٹی پارلر کی فنکاریاں ہوں، معاشرتی رویے ہوں یا شعبہ جاتی کجیوں کا بیان ان کا قلم بڑی سرعت سے حقائق کو طنز و مزاح کے پیرائے میں ڈھال کر منظر ادب پر لاتا ہے۔ میاں بیوی کی نوک جھوک پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

کہا بیوی نے موبائل بٹن والا دیا ہے کیوں
چلے انگلی سے میری اس میں یہ جوہر نہیں دیکھا
کہا شوہر نے چھوٹی سی مشینی چیز ہے یہ
چلے انگلی پہ تیری یہ تیرا شوہر نہیں ہے

.....

انھوں نے بیشتر مقامات پر اپنی شاعری میں بڑی مہارت سے انگریزی الفاظ اور قافیوں کا فنکارانہ استعمال کیا ہے الفاظ کے ردوبدل اور جوڑ توڑ سے وہ کلام میں رنگینی پیدا کرنے میں وہ کمال رکھتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

کمی چھوڑی نہ کوئی پرورش میں اسکی ماں نے
لگے تھے بیس سال ان کو اسے جینٹل بنانے میں
ہوئی شادی تو اس کی اہلیہ کا یہ ہنر دیکھیں
لگائے دس منٹ اس نے اسے مینٹل بنانے میں

.....

معاشرے میں شوہر کے بارے میں خواتین کا جو رویہ ہے اس کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

میں نے اس سے کہا جلدی چل
ہم نے پاؤں ملا کے رکھنا ہے
بولی پیچھے چلوں گی میں تیرے
تجھ کو آگے لگا کے رکھنا ہے

.....

وہ اپنے کلام میں کسی کی دل آزاری نہیں کرتے اور نہ کسی کی ذات کو اپنے طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں، بس ہلکا سا کانٹا چبھو کر متوجہ کرتے ہیں اور کبھی کبھار بغرض اصلاح نتیجہ بھی تجویز کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ نہایت مہارت سے مشکل صورت حال کو ظریفانہ انداز میں یوں قابو میں رکھنے کی تجویز دیتے ہیں:

آپ کی بیوی اگر غصے کی کافی تیز ہے
آپ کو دیتا ہوں اک تجویز اس بھونچال کی
آپ اس سے کہہ دیں طیش میں لگتی ہو تم بوڑھی بہت
مسکراتی ہو تو لگتی ہو سولہ سال کی

.....

جدید دور میں میک اپ اور بیوٹی پارلر کے کرشماتی کمالات کو اپنے ایک قطعہ میں یوں بیان کرتے ہیں:

غازے نے اس کا روپ نرالا بدل دیا
لیلیٰ کے چاند چہرے کا ہالہ بدل دیا
مجنوں بھی اس کو دیکھ کے حیران رہ گیا
میک اپ نے اس کا رنگ ہی کالا بدل دیا

.....

پیروڈی کو ہر دور میں طنز و مزاح کا خاص ہتھیار سمجھا جاتا رہا ہے اور قریباً ہر مزاح نگار نے اسے اپنے

کلام میں بخوبی استعمال کیا۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے بھی نسلِ نو میں تیزی سے پھیلتی ہوئی بیہودگی اور بے راہ روی کو شاہین کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے اقبال کے کلام کی پیروڈی کی ہے:

حقیقت ہے نہیں یہ بات قصوں یا فسانوں کی
ادائے خاص ہے اقبال کے شاہین گھرانوں کی
لڑانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں حسینوں سے
عقابی آنکھ جب بیدار ہوتی ہے جوانوں کی

.....

انھوں نے آبادی میں اضافے، کثرتِ اولاد خاندانی منصوبہ کے قوانین کی خلاف ورزیوں اور قوم کے رویوں کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انھوں نے اس پیچیدہ صورت حال کو افرادِ معاشرہ کے ذوق وشوق کو کثرت اولاد سے منسوب کیا ہے۔ اس ضمن میں دو رقم طراز ہیں:

منصوبہ بندی کا سگنل لال کرو
لال اشارہ ہر گاڑی کو روکے گا
سبز اشارے پر تو دنیا چلتی ہے
''سبز ستارہ'' کیسے بچے روکے گا

.....

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کا قطعہ ''مہنگائی'' اس صورتِ حال کی عکاسی مخصوص طنزیہ پیرائے میں کرتا ہے:

تخصیص کی نہ کوئی پیر و مرید کی
مہنگائی نے ہر ایک کی مٹی پلید کی
کچھ اس طرح سے دبوچا ہے گردن سے قوم کو
خوشیاں تمام چھین لیں لوگوں سے عید کی

.....

موجودہ دور میں حکمران طبقے کے پاس سوائے قرضے اور امداد لینے کے کوئی حل موجود نہیں ان غیر ملکی قرضوں نے ملکی معیشت کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اس تمام صورت حال کو ڈاکٹر سعید اپنے مخصوص شگفتہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

میں تو کہتا ہوں کھالیں واپڈا کو دیں سبھی
اس سے کچھ بجلی کی سپلائی سنواری جائے گی
ورنہ خود قربان ہونے کے لیے تیار ہوں
اگلے ہر بل میں تمھاری کھال اتاری جائے گی

.....

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے اپنے قطعہ بعنوان ''لیڈرستان'' میں ملک میں وزیروں مشیروں کی اکثریت کو یوں بیان کیا ہے:

لیڈر عوام سے بھی زیادہ ہیں ملک میں
کاؤنٹنگ یہ میں نے کی ہے بڑی دیکھ بھال کے
میرا خیال تھا کروڑوں میں ہیں عوام
یہ چند لاکھ نکلے ہیں لیڈر نکال کے

.....

اپنے آپ کو روشن خیال کہلوانے والی عورتیں کرونا میں پردہ کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ وہی عورتیں جو پردے کا مذاق اڑاتی تھیں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے اپنے مجموعہ ''مذاق'' میں اس کی تصویر کشی کی ہے:

اب آگئی ہیں عورتیں ساری نقاب میں
کووڈ نے اپنا خوف حسینوں میں بھر دیا
وہ کام جو بڑے بڑے عالم نہ کر سکے
وہ کام ایک چھوٹے سے وائرس نے کر دیا

.....

بیشتر ڈاکٹر صاحبان سرکاری ہسپتالوں میں اپنے فرائض منصبی بخوبی انجام دینے کے بجائے ذاتی مطب پر اپنا

کاروبار چمکاتے ہیں۔ ان کی اس روش کو ڈاکٹر سعید اقبال سعدی اپنے کلام میں یوں پیش کرتے ہیں:

پیشے کے جوہروں سے جو عاری ڈاکٹر ہے
اب ہسپتال میں وہ سرکاری ڈاکٹر ہے
وہ دیکھتا ہے اکثر اپنے مریض گھر پر
بس ''آوٹ ڈورز'' سے وہ انکاری ڈاکٹر ہے

.....

اردو شاعری میں ''مُلّا'' اور واعظ پر بہت اشعار کہے گئے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی شاعر نے اپنے کلام میں ''مُلّا'' کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ''منافقت'' کے عنوان سے ایک قطعہ تحریر کیا ہے، جس میں ملا کی چالاکی اور منافقت کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے:

کل دیکھ کے تھیٹر میں کہا ملاں سے میں نے
بچ پائے نہیں آپ بھی رقصوں کے اثر سے
سن کر وہ میرا طنز ذرا جھینپ کر بولا
دیکھا ہے اُسے میں حقارت کی نظر سے

.....

ڈاکٹر سعدی اپنے ایک قطعہ بعنوان ''شادی'' میں رقم طراز ہیں:

شادی کا شوق تھا تو فقط اس لیے ہی تھا
شادی کے بعد دیکھے گا وہ پیار کی خوشی
شادی کے بعد خوشیاں ملی ہیں کچھ اس طرح
ہر غم کو سہہ رہا ہے وہ ہنس کر خوشی خوشی

ساس بہو کی تکرار کو اپنے مخصوص مزاحیہ اسلوب میں پیش کرتے ہوئے شاعر لکھتے ہیں:

میں نے پوچھا ساس کو کیسی بہو کا شوق ہے؟
ہنس کے بولی خوبصورت، خوب سیرت، مالدار
ہر سلیقہ اپنی گھرداری کا آتا ہو اُسے
گھر کے کاموں میں لگی رہنے کا جس کو ہو شعار
کپڑے دھونا جھاڑو دینا اور برتن مانجھنا
گھر کے ان کاموں کو کرنے سے ملے جس کو خمار
جانتی ہو اپنے رشتوں کا نبھانے کا ہنر
اپنی نندوں کے مزاجوں کو جو رکھے خوشگوار
سُن کے ماں کی بات میں نے اپنی بیٹی سے کہا
تم کو اپنی ساس کیسی چاہیے، جانِ بہار؟
بیٹی بولی ایک ہی سادہ سی خواہش ہے مری
مجھ سے پہلے جا چکی ہو ساس اس دنیا کے پار

.....

درجہ بالا موضوعات کے علاوہ بہت سے ایسے موضوعات کو شاعری میں بیان کیا گیا ہے جو ہمارے معاشرے میں لازمی جزو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے ''ماڈرن فقیر'' کے عنوان سے تحریر کردہ قطعے میں پیشہ ور اور جعلی فقیروں کا مکروہ چہرہ دکھایا ہے تو کبھی زعفرانی غزل میں نوجوانوں کی بے راہ روی کو بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے کلام میں جہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے وہیں معیار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے سنجیدہ شاعری میں اپنا الگ تشخص اور معیار قائم کیا ہے تو طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں بھی ہماری معاشرت کی صحیح انداز میں عکاسی کی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر انھوں نے لکھا جہاں مثبت پہلوؤں کو سراہا وہیں منفی اثرات کی نشاندہی بھی کی اور ان کی بیخ کنی کے لیے تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

☆☆☆☆☆

رانا محمد شاہد کے کالموں میں سماجی شعور

رانا محمد شاہد 20 دسمبر 1982 کو رائے ونڈ (لاہور) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام رانا محمد اسلم ہے۔ان کے والد محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔یوں ان کا بچپن رائے ونڈ شہر کے ریلوے کوارٹرز میں گزرا۔رانا محمد شاہد نے ابتدائی تعلیم انھی کوارٹرز کے قریب موجود پرائمری سکول سے حاصل کی۔جہاں صرف دو اساتذہ پر مشتمل اسٹاف تھا۔ والد کی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ بوریوالا آ گئے اور پھر یہاں کے ہی ہو گئے۔ بورے والا شفٹ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ان کے والد نے یہاں اپنا گھر تعمیر کیا تھا۔بورے والا آنے کے بعد دوبارہ پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔اس وقت ان کی عمر تقریباً سات سال تھی۔اس طرح ابتدائی تعلیم انھوں نے دو شہروں سے حاصل کی۔میٹرک ایم سی ماڈل ہائی سکول سے کیا۔جبکہ ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج سے کیا۔کالج دور میں ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔متعدد بار مضمون نویسی اور کوئز مقابلہ جات میں پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔کالج میگزین ''الفرید'' کے مدیر بھی رہے۔اس کے بعد پرائیویٹ ایم اے پولیٹکل سائنس کا امتحان دیا۔پارٹ 1 کلیئر تھا مگر پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔اگر ان کے لکھنے کی بات کی جائے تو پہلی تحریر 1994 میں لکھی۔بچوں کے رسالوں سے لکھنے کی ابتدا کی۔نونہال، آنکھ مچولی، پھول، تعلیم و تربیت، بچوں کا باغ، ساتھی، انوکھی کہانیاں اور اقراء وغیرہ نمایاں ہیں۔بطور مضمون نگار اور کہانی نویس ان کو متعدد اعزازات ملے۔

2001 میں گورنمنٹ کالج بورے والا کی نمائندگی کرتے ہوئے آل پاکستان قائداعظم کوئز میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں منعقدہ اس مقابلے میں پاکستان بھر سے 16 کالجز اور دو یونیورسٹیز نے شرکت کی تھی۔بطور مضمون نگار ساتھی ایوارڈ 2016، 2019 اور 2021 حاصل کیے۔جبکہ بطور کہانی نویس آفاق لیڈرز کلب کے زیر اہتمام رحمت العالمین ادبی ایوارڈ 2016 اور 2017 خصوصی انعام

عائشہ کلثوم

بمعہ کیش وصول کیے۔

ان کی کتاب ''طناب فکر'' بار اول ستمبر 2021 میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں ان کے 34 کالمز شامل ہیں۔ان میں سے ایک کالم'' یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' کا مطالعہ درج ذیل ہے۔

اسلوب:''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے بہت خوبصورت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ان کے لکھنے کا انداز بہت دلنشیں اور دلفریب ہے۔انھوں نے الفاظ کا چناؤ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کے الفاظ آسان فہم ہیں۔ الفاظ کی ترتیب بہت خوبصورت اور دردمندانہ انداز سے کی گئی ہے۔مثال کے طور پر جب ''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں بس والا واقعہ آتا ہے تو ایک آدمی کہتا ہے کہ''غریب کی بھی کوئی زندگی ہے۔غریب کو تو مر جانا چاہیے''۔

غریب طبقے کی عکاسی:''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے غریب طبقے کی عکاسی بہت دلچسپ انداز میں کی ہے۔غریب طبقے کے لوگوں کی کیا اہمیت ہے اور ان کو کس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں کہ''امیر اور غریب کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہا ہے''۔ ان کی یہ تحریر بتاتی ہے کہ کیا غریب انسان نہیں ہیں۔انہیں خوش ہونے اور خوش رہنے کا کوئی حق نہیں۔ان کی تحریر'' یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں ایک مثال کے ذریعے وہ غریب طبقے کی یوں عکاسی کرتے ہیں۔''چند برس پہلے کی بات ہے ان دنوں کراچی آیا ہوا تھا۔صدر بازار سے بس کورنگی کراسنگ کے لیے روانہ ہوئی تو راستے میں ایک دم رک گئی۔جس سے مسافر اگلی سیٹوں پر جا لگے۔پھر بھی مسافر بس سے باہر آ کر دیکھنے لگے کہ آخر ہوا کیا ہے۔شور کی شدت کی وجہ سے میں بھی نیچے اتر آیا۔ہوا کچھ یوں کہ ایک کاغذ اٹھانے والا شخص اچانک بس کے سامنے آ گیا تھا۔اچانک بس کے سامنے آنا اس کا جرم بن گیا۔بس کے ڈرائیور، کنڈیکٹر اور اور کچھ مسافروں نے مل کر اسے مارا۔اس کے بعد مسافر بس میں آ بیٹھے۔بس چل پڑی تو میرے ساتھ بیٹھا شخص بولا۔غریب کی بھی کوئی زندگی ہے۔غریب کا تو مر جانا بہتر ہے۔تھوڑی دیر پہلے کے منظر نے جو درد دیا تھا۔اس شخص کے ان الفاظ نے اس کی شدت میں اضافہ کر دیا۔''امیر طبقے کا رویہ:''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے امیر طبقے کے سخت اور ظالمانہ رویے کا بھی ذکر کیا ہے۔امیر کا غریب کو حقیر سمجھنا اور ان سے غلط طریقے سے بات کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔اس ظلم میں کبھی زبان کا اور کبھی ہاتھ کے استعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔جس کے جواب میں غریب کچھ نہیں کر سکتا۔اس کا اندازہ اوپر بیان کئے گئے واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔اسی طرح مصنف ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔ چند دن پہلے گھر کا سودا لینے دوست کے ساتھ بازار گیا۔ایک سبزی فروش سے آلو کا ریٹ پوچھا تو اس نے تیس روپے کلو بتایا۔دوست موٹر بائیک پر ٹوپیں میں ملبوس تھا۔وہ بولا'' تو زیادہ ریٹ لگا رہا ہے''۔ ریڑھی والے نے بیچارگی سے کہا۔

''آپ بینک منہ پر تھپڑ مار کر سارا کچھ لے جائیں۔ ہمارا کیا ہے، غریب کی بھی کوئی زندگی ہے۔ اسے جب چاہیں جہاں چاہیں مار پیٹ لیں، وہ کچھ نہیں کہے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا''۔

حقیقت نگاری: ''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے امیر اور غریب طبقے کی عکاسی کی ہے۔ جس میں ان کا ایک ایک لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے امیر طبقے کا غریب طبقے سے غلط رویے کو بیان کیا ہے۔ رانا صاحب غریبوں کے لیے ہمدردی اور محبت کا جذبہ رکھتے ہیں اور ان کی تحریر بھی اسی وجہ سے حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں کرتی ہے۔ وہ غریبوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''طاقتور لوگ اپنے مفادات کے لیے غریب لوگوں کی جانوں کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے''۔ اس کے علاوہ ان کی تحریر میں خود شناسی کا وصف بھی نمایاں ہے کہ انسان خود کو نہیں پہچانتا کہ وہ خود کتنا غلط ہے بلکہ وہ دوسروں پر انگلی اٹھاتا ہے کہ فلاں انسان اتنا برا ہے۔ اس سے بات نہ کرو۔

حقیقت نگاری کے درج ذیل پہلو تحریر میں نمایاں ہیں۔

انصاف کی فراہمی: ''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے انصاف کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں غریب کو انصاف نہیں ملتا۔ لیکن طاقتور طبقے نے اگر کوئی غلط کام بھی کیا ہو تو وہ انصاف لے جاتا ہے۔ جس کی عکاسی وہ اپنی تحریر میں یوں کرتے ہیں۔ ''اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم یا روزگار نہیں بلکہ انصاف ہے۔ عوام کو ملنے والی تمام سہولتوں کا تعلق براہ راست انصاف سے ہے۔ غرض کہ ساری معاشرتی زندگی کی بنیاد ہی انصاف پر ہے۔ جس ملک کی عدالتیں بلاتفریق انصاف فراہم نہ کر سکیں، وہاں حب الوطنی کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا''۔

خود شناسی: ''یہ دور محبت کا لہو چاٹ چکا ہے'' میں رانا محمد شاہد نے معاشرے میں اچھے اور برے انسان کی بھی عکاسی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان خود کتنا برا کیوں نہ ہو، وہ دوسرے انسان کو برا کہتا ہے۔ بجائے یہ کہ ہم خود کو جانیں، پہچانیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ غلط اور صحیح میں فرق کریں، اپنا تجزیہ کریں۔ ہم ہمیشہ دوسرے کو برا کہتے ہیں۔ رانا صاحب نے اس کڑوے سچ کو بے خوف ہو کر کھلے الفاظ میں سب کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس کی عکاسی وہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

''علامہ اقبال نے تو شاید کسی اور پس منظر میں کہا ہو'' چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر''۔ لیکن ہم عملاً ایک ایسا وحشی معاشرہ بنتے جا رہے ہیں۔ جس نے اپنے چہرے پر نام نہاد تہذیب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خود کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم کہتے نہیں تھکتا۔ ہم خود کو حق پر اور سچا جبکہ دوسرے کو باطل اور جھوٹا کہنے سے باز نہیں آتے۔ ہم نے ہمیشہ دوسروں کے عیبوں کو تلاش کیا اور اپنی خوبیوں پر نظر رکھی''۔

☆☆☆☆☆

کرتار پور اور ہم

پندرہ دسمبر کی یخ بستہ صبح افراتفری سے شروع ہوئی -رات کی مکمل تیاری کے باوجود ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ دیر نہ ہو جائے کہیں-- ساڑھے اٹھ بجے لبرٹی میں سب نے جمع ہونا تھا-- اٹھ بجے ہم جلدی جلدی گاڑی میں بیٹھے جو بیٹا پہلے ہی سٹارٹ کر کے ہمارا انتظار کر رہا تھا-- بیٹی کو بھی ساتھ لیا کیونکہ اسے بھی کالج چھوڑنا تھا سیدھے نیلم جی کے گیٹ کے پاس پہنچے تو میرے ناک کرنے سے پہلے ہی اپنی مدھر مسکراہٹ بکھیرتی باہر آ گئیں تو گاڑی میں بیٹھتے ہی لبرٹی کی طرف ہم رواں دواں ہو گئے- راستے میں سکول-- کالج- یونیورسٹی-- دفتر اور کام پر جانے والوں کا رش بھی سنگ تھا-- خیر جب مطلوبہ جگہ پر پہنچے تو گاڑی کیا -- گروپ کی کسی خاتون کا کوئی نشان تک نہ تھا-- نیلم جی نے یہ سناٹا دیکھ کے گاڑی کا رخ اپنی سٹار بہن اسما عباس صاحبہ کے گھر کی طرف کروا دیا-- ڈور بیل پر ان کی ہیلپر نے گیٹ کھولا تو ہمارا سامان گیراج میں رکھ کر بیٹا تو بیٹی کو کالج چھوڑنے چلا گیا اور ہم اسما جی کے سجے سجائے خوبصورت ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے-- حسین اور سمارٹ پیاری سی مسکان کے ساتھ اسما عباس آ گئیں-- چائے پانی کا پوچھا-- ہم نے پُر باش کا سگنل دیا تو شاندار ڈریسنگ سے وہ سبک خرامی سے چلتی ہوئیں گاڑی میں بیٹھیں جو کے ان کا بیٹا ڈرائیو کر رہا تھا ساتھ میں ہم دونوں بھی لبرٹی میں جوس کارنر کے پاس پہنچے تو گاڑی کھڑی تھی اور منزہ جی جنھوں نے پروگرام مرتب کیا تھا-- وہ اور انجم-- ادیبہ - فائزہ موجود تھیں - - نیلم جی تو اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئیں اور میں اندر سے تھوڑی جھجک میں تھی-- اصل میں یہ سب میرے لئے اجنبی تھے-- مگر میرے سلام کے جواب میں منزہ جی کا گرم جوشی سے جواب دینا اور ادیبہ-- فائزہ- انجم دھیمی مسکراہٹ سے ملنا اپنائیت میں تبدیل ہو گیا- یوں پھر نغمانہ-- ثمن-- عمرانہ اور ان کی تینوں پیاری سی بیٹیاں-- اسما جی کی نند کوثر ساتھ میں ان کی سوہنی سی بیٹی-- یوں پھر 9 بج کے 28 منٹ پر یہ کارواں سفر کی دعا پڑھتے ہوئے عازم سفر ہوا- یہ گروپ اسما

نسیم سکینہ صدف

جی کی معیت میں کرتار پور بابا گرونانک کے گردوارہ صاحب میں روانہ ہوا۔ تھوڑا سا سفر گزرا تو سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کھانے کو کون کون کیا لایا ہے۔۔ کوئی مولی والے پراٹھے۔ کسی نے سینڈوچ۔ تو کوئی فروٹس۔ پی نٹ۔۔ کولڈ ڈرنکس۔۔ منرل واٹر۔۔ غرض کہ کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔۔ موٹروے سموگ کی وجہ سے بند تھا لہٰذا جی ٹی روڈ کا سفر شروع ہوا تو کھانے والی چیزیں وقفے وقفے سے نکلتی رہیں جو ہم مزے سے کھاتے رہے۔۔ لاہور سے کرتار پور اڑھائی گھنٹے کا سفر تھا بقول گوگل کے۔۔ پھر جو گاڑی والے سے گیت چلوائے ہیں۔۔ اور ساتھ میں سب کی عمدہ اور اعلیٰ پرفارمنس۔۔ سفر میں گزرتے گھنٹوں کا پتہ ہی نہ چلا اور ساڑھے بارہ بجے ہم کرتار پور پہنچ گئے۔۔ منزہ جی کی ہدایت کے مطابق ہم سب اتر کے فریش ہونے کے بعد انٹر ہونے لگے تو چار چار سو انٹری کے پکڑ لئے۔۔ جو آئی ڈی کارڈ کے ساتھ جمع کروانے تھے۔ اتنی دیر میں اسما جی کو کرتار پور گوردوارہ صاحب کی ٹیم نے پھول پیش کیے اور ان کی عمدہ پزیرائی کی اور گروپ فوٹو لی گئی۔۔ پھر جب ہم گوردوارہ کے اندر انٹر ہوئے تو اسما عباس کے پروٹوکول میں ہم سب کو فری اندر لے جایا گیا۔ سب سے پہلے گرونانک صاحب کے متعلق بڑی سکرین پر ڈاکومنٹری دکھائی گئی کہ انھوں نے زندگی کتنی مشقت سے گزاری اور اپنی عبادات کا ساتھ نہ چھوڑا۔۔ وہیں پھر جوتے اتارے۔۔ دوپٹے سے سر تو ہم اندر انٹر ہوتے ہی ڈھک چکے تھے۔۔ پھر سفید ٹائلز کے بنے فرش پہ ننگے پاؤں چلتے چلتے کنواں کے پانی میں پیر ڈبوئے جس سے دماغ تک ٹھنڈک اتر گئی۔۔ پھر گرم گرم سی دھوپ نے کھلے آسمان تلے ہمیں جرسیاں اتارنے پر مجبور کر دیا پہلے بڑی سی گولڈن تلوار دیکھی گئی پھر سارا گروپ گوردوارہ کے اندر داخل ہوا جہاں ان کی کتب تھیں۔۔ وہاں اور نج پٹیاں گلے میں ڈالی گئیں اور ساتھ دیسی گھی میں بنا حلوہ دیا گیا۔۔ باہر نکلے تو کنواں تھا جس کا پانی گرونانک صاحب استعمال کرتے تھے۔ اس کو دیکھ کر باہر نکلے تو اس پانی کی بوتلیں سب کو دی گئیں۔ باادب طریقے سے سب نے وہ اپنے بیگز میں رکھ لیں۔ وہاں بہت سے لوگ انڈیا سے آئے ہوئے تھے۔۔ بہت رونق تھی۔۔ لیکن ایک سناٹا بھی تھا جو دلوں کو دستک دے رہا تھا۔ اب ہماری منزل لنگر ہال تھی۔۔ جہاں پہنچ کے محسوس ہوا کہ صفائی تو یہاں ختم ہے۔۔ ہر برتن صاف اور ترتیب سے ہمیں پکڑاتے گئے ایک بڑی پلیٹ میں

چھوٹے چھوٹے حصے بنے ہوئے تھے-- جس میں باری باری روٹی- چاول- دال- اچار اور سویابین کی سبزی-- جو نہایت لذیذ ذائقہ دے رہی تھی-- منزہ جی کا بار بار پوچھنا کہ سب کچھ ملا ہے نا-- اور نیلم جی کہیں تھک تو نہیں گئی چلتے چلتے-- بہت اچھا لگا-- پھر نفاست سے سٹیل کے گلاسوں میں مزے دار چائے دی گئی-- جس سے سفر کی تھکان ہوا ہو گئی-- پھر واپسی میں ہم بازار میں آئے-- ان اوقات میں اسما جی کے فینز ان کے ساتھ تصویریں بنواتے رہے-- بازار تو انڈیا کے لوگوں کے لیے لگایا گیا تھا-- ان میں ہمارے ملک کی کپڑے اور دیگر چیزیں تھیں-- جب ہم باہر نکلے تو ایک بڑی سی بس ہماری منتظر تھی جو ہمیں چار کلو میٹر تک بارڈر پہنچی- چونکہ شام کے چار بج چکے تھے تو ہمسایہ ملک سے آنے والوں کا ٹائم ختم ہو گیا تھا اور وہ دھڑا دھڑ واپس جا رہے تھے-- ان کا یہاں رکنا بس چار بجے تک الاؤ تھا-- بہت محبت والے لوگ تھے-- ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا تو بس کی کھڑکی سے ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے ایک اداسی در آئی-- اتنے میں منزہ جی کی آواز آئی-- وہ ہم سب کے نام پکار رہی تھیں اور ہم پریزنٹ میں ہاتھ ہلا کے بتا رہے تھے- ہم ان کی محبت- خلوص کو سراہتے ہوئے اپنی گاڑی میں آن بیٹھے-- جی ٹی روڈ کے دھکم پیل میں ساتھ خوبصورت گیت چلتے رہے-- واپسی پر سب ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور باقی چیزوں کا خاتمہ کرتے رہے- اندھیرا پھیلتے ہی منزہ جی ایک ڈھابے پر بس رکوائی اور خالص دودھ پتی بنوائی-- اس چائے کے ساتھ اسما عباس جی کے لائے ہوئے حلوے-- پیٹھے کا حلوہ-- گاجر کا حلوہ- اور چنے کی دال کا حلوہ جو کہ خالص دیسی گھی سے تیار کیے ہوئے تھے-- وہ کھائے اور مزے دار چائے پی اتنے میں اسما جی کے فینز نے انکو گھیر لیا مگر ٹائم کی کمی کے باعث ایک دو تصاویر کے بعد ہم گاڑی میں ان بیٹھے اور پھر اس میں -- لیلیٰ میں لیلیٰ اور نور جہاں کے اشاروں اشاروں میں دل لینے والے ___ تو نے یہ ہنر سیکھا کہاں سے-- اور اس طرح کے شوخ گیت سنتے گاتے سفر تمام ہوا خوبصورت یادوں کے دیپ لیے ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کرتے اترے جہاں میرا بیٹا اور بیٹی ہمارے منتظر تھے- سب سے پہلے بہت شکریہ اسما عباس کا جنھوں نے اتنی پیاری سہیلیوں سے ملوایا پھر منزہ جی کی شکر گزار ہوں-- جنھوں نے اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور نیلم جی کے خلوص کے کیا کہنے ہیں-- سدا سلامت رہیں--

☆☆☆☆☆

انجم معین بلے کی نظم ''اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

سید انجم معین بلّے نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ شعری روایت کے امین بھی ہیں۔ ایک ایسی روایت کے جو قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ یہ دلچسپ امانت ان کے ورثے میں یوں آئی ہے کہ ان کے والد بھی شاعر تھے اور ان کے سب بھائی بھی شعر و ادب سے وابستہ ہیں اور سب کے اپنے اپنے ادبی زاویے تھے اور ہیں۔ سید فخرالدّین بلّے صاحب، یعنی ان کے والد، ادب جن کا اوڑھنا بچھونا تھا، اس روایت کو بزرگوں سے ملاتے ہیں۔ ان کے منجھلے بھائی سید عارف معین بلے جو نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ مترجم بھی ہیں اور عربی اور فارسی کلام کے منظوم تراجم کر چکے ہیں۔ ان کے جواں مرگ چھوٹے بھائی آنس معین جو صاحبِ اسلوب شاعر تھے اور اس روایت کو جدّت کے رنگوں سے سجاتے ہیں اور ان کے سب سے چھوٹے بھائی ظفر معین بلّے جو زندگی بھر ادب سے وابستہ رہے، نثر نگاری، شاعری، انٹرویوز اور ادبی رسائل آواز جرس اور ادبِ لطیف کی دہائیوں پر محیط ادارت ان کی پہچان ہیں۔ یعنی بات صرف شعری روایت کی نہیں ہے، ان کے اور ان کے گھر والوں کو تر کے میں ایک مکمّل ادبی روایت ملی ہے جو نظامِ زندگی کی شکل وضع کرتی ہے اور پھر اس سے جڑی محبتوں کی روایت ہے۔ محبت جس خاندان کے رگ و پے میں ہو، اس کا لائق امین اس سے کسی طرح الگ ہو بھی نہیں سکتا۔ یہی محبت ہے جو سوز کی آبیاری کرتی ہے اور ساز میں سنائی دیتی ہے۔ اسی سوز و ساز کا ایک سنگم سید انجم معین بلّے کی یہ نظم

فیصل عظیم

ہے جس کا عنوان ہے۔ اک سمندر درمیاں ہے، اک سمندر درمیاں۔

محبت میں گندھی یہ پرسوز نظم، انجم معین بلے نے اپنی بیوی اور بیٹے کی یاد میں لکھی ہے جس پر اداسی کے بادل چھائے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کی یاد کا یہ ایسا سفر ہے جو خیالوں کا سفر ہے مگر اس کا آغاز نہیں ہو پا رہا۔ جیسے پانی کی سطح پر آتی جاتی لہروں میں کوئی کشتی ایک ہی جگہ ہچکولے کھاتی رہے مگر اس مقام سے نہ آگے جا سکے نہ پیچھے۔ اس نظم کا جو عنوان ہے، وہی اس کا ٹیپ کا مصرع بھی ہے جس میں نظم کا خلاصہ موجود ہے۔ یہ نظم دراصل ہر اس شخص کے یادوں میں ڈوبے، دکھے دل کی آواز ہے جو اپنوں سے اور اپنے دل کے قریب رہنے والوں سے دور ہو جائے۔ یہ دوری وقتی بھی ہو سکتی ہے اور زندگی بھر کی بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے ہاں اگرچہ ایک مستقل جدائی کا دکھ ہے مگر وہ دوری میں قربت محسوس کیے بغیر نہیں رہتے اور اس قربت میں جو فاصلے ہیں، ان سے بھی نظر نہیں ہٹا پاتے، کہ جو ان کے پاس نہیں، وہ ہر وقت دل میں دھڑکتے ہیں۔ گفتگو کا سلسلہ کٹ جانے کے باوجود وہ اپنے ان دونوں محبوبوں سے ہم کلام رہتے ہیں۔

یہ نظم ان سب لوگوں کے دلوں کو چھونے والی نظم ہے جنھوں نے دوری محسوس کی ہو۔ کوئی جسمانی طور پہ دور ہو یا جذباتی طور پہ۔ کوئی زمینی فاصلے کی وجہ سے دور ہو جائے یا دنیا سے جا چکا ہو اور ہر طرح کے فاصلے درمیان میں آ گئے ہوں۔ اس نظم میں سمندر ان تمام فاصلوں کا استعارہ ہے جسے پار کرنا کسی کے بس میں نہیں کیونکہ یہ وہ سمندر ہے جسے پار کرنا ممکن نہیں۔ یہ سمندر زمانی بھی ہو سکتا ہے، زمینی بھی اور روحانی بھی۔

اس نظم کو معنویت سے ہٹ کر پڑھنے کا بھی ایک اپنا لطف ہے۔ سادہ اسلوب میں لکھی یہ نظم جذبوں کے پرخلوص اور تصنع سے عاری اظہار سے عبارت ہے۔ لفظوں کا چناؤ سوچ کے بہاؤ کے مطابق ہے۔ بہت سے عام بول چال کے الفاظ اس میں بہت سادگی سے سمو دیے گئے ہیں۔ اس نظم کی ہیئت اور روانی گیت کا سا انداز رکھتی ہے۔ یعنی اس نظم کا بہاؤ بھی لہروں کے بہاؤ کی طرح ہے۔ اس میں جو آہنگ ہے وہ قاری کی شاعرانہ طبیعت کو مہمیز دیتا ہے اور پڑھنے والا اس کی موسیقیت سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن اس موسیقیت اور آہنگ میں جذب کی کیفیت بہرحال قائم رہتی ہے جو دل میں سوز جگائے رکھتی ہے اور یہی اس نظم کی خاص بات ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

یہ سخن عرشِ ہُنر تک پہنچے
تیر کوئی تو مگر تک پہنچے

لوگ آوازۂ کُہسار ہُوے
آئنے ، آئینہ گر تک پہنچے

ہم بھی چُپ چاپ بکھر جانے کو
چُپ بن کر ترے دَر تک پہنچے

آگے بڑھنے کی لگن کام آئی
لوگ کب وجہِ سفر تک پہنچے

پو پھٹی ہے کہ شفق پُھولی ہے
شام کے رنگ ، سحر تک پہنچے

گرد ٹھہری ہے ہوا کی ساتھی
کیا خبر کب ترے گھر تک پہنچے

دَھن دھندلکے میں بجھائی کیا دے
زرِ گُل کیا گُلِ زر تک پہنچے

پتّیاں ہیں کہ برستی آنکھیں
کوئی طائر تو شجر تک پہنچے

مل گئے خاک میں آنسو خالد
منزلِ عرضِ ہنر تک پہنچے

خالد احمد

غزل

مری ناکام اڑانوں سے بھی ڈرنے لگا ہے
دیکھ کس طور عدو حوصلہ ہَرنے لگا ہے

اِس قدر جوشِ خطابت تری گفتار میں کیوں
کیا کسی بات سے پھر آج مکرنے لگا ہے

بے سبب کم نہیں ہوتی کبھی تاثیرِ ہنر
تیری سوچوں میں کوئی زعم اترنے لگا ہے

دو قدم ساتھ ذرا چلنا پڑا کیا اُس کے
وہ فسوں گر مرے خوابوں پہ اثرنے لگا ہے

بہت آگے کہیں جا کر جنہیں وا ہونا ہے
اُن دریچوں سے بھی احساس خبرنے لگا ہے

دمِ خوش خُو غمِ بدخواہ پہ ہوں افسردہ
جمع ہونے لگا میں اور وہ بکھرنے لگا ہے

یہ جو سوچوں کے ہیولوں میں مچی ہے ہلچل
ایسے لگتا ہے کوئی نقش ابھرنے لگا ہے

کون لفظوں کہیں عالی کہ نواحِ دل و جاں
کیسی یادوں کے محاکات سے بھرنے لگا ہے

جلیل عالی

غزل

چُپ نہیں بیٹھتے کیوں آپ، مصیبت کیا ہے
کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کی ضرورت کیا ہے

چھوٹ سکتی ہے بھلا خواہشِ خوباں مجھ سے!
فطرتِ ثانیہ ہے یہ مری عادت کیا ہے

پُرکشش ہیں وہ ہمارے لیے، ہم اُن کے لیے
کون جانے یہ ہوس ہے کہ محبت، کیا ہے

آ کے مہنگائی کے ماروں سے تو پُوچھو صاحب
کون سی چیز کی بازار میں قیمت کیا ہے

عمر بھر جمع بھی، واحد بھی رہے ہم دونوں
ایک دیرینہ تعلّق ہے، رفاقت کیا ہے

تیز رفتار ہیں کیوں اِس قدر اِس دور کے لوگ
جیسے جاری ہو کوئی دوڑ، یہ عجلت کیا ہے

کبھی فٹ پاتھ پہ سوئے نہ کبھی فاقہ کیا
پھر شعور آپ کو قسمت سے شکایت کیا ہے

انور شعور

غزل

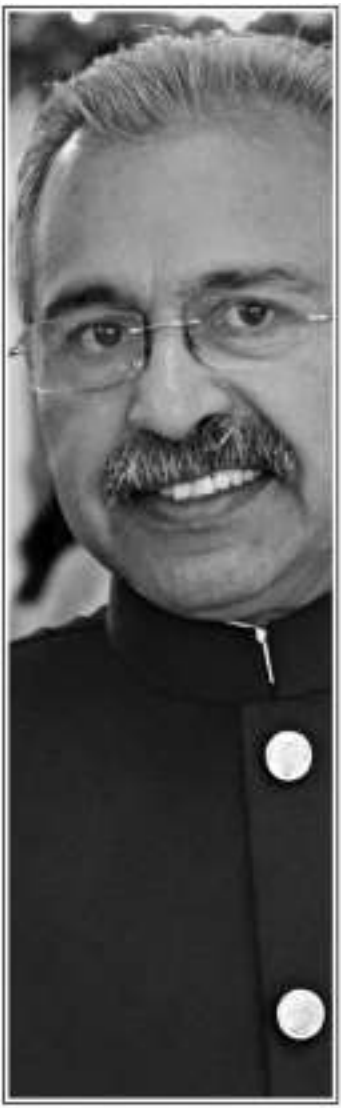

یقین ہو بھی تو خود کو خدا کبھی نہ سمجھ
کہ مختصر ہے بہت عمرِ آبگینہ سمجھ

تو ظلم کرتا رہے اور میں بددعا بھی نہ دوں
ہوں ایک عام سا شہری مجھے نبی نہ سمجھ

کوئی کنارے لگا دے گا تیری کشتی کو
اگر میں پہلا نہیں تھا تو آخری نہ سمجھ

تمام عمر یہاں قیدِ با مشقت میں
گزارتے ہیں جو ہم لوگ زندگی نہ سمجھ

بگاڑ دیتے ہیں گر کم سنی میں لگ جائیں
یہ داؤ پیچ محبت کے تو ابھی نہ سمجھ

اتار آنکھوں سے شب کے فریب کی عینک
اجالے جیسے اندھیرے کو روشنی نہ سمجھ

سمجھ تو آ ہی گیا ہو گا منہ کے بل گرنا
تجھے یہ کس نے کہا تھا کہ مجھ کو زینہ سمجھ

جو دل پہ ہاتھ نہ ڈالے وہ بات کیا راحت
ردیف و قافیہ بندی کو شاعری نہ سمجھ

راحت سرحدی

غزل

ذرا سے بیج میں بھی حوصلہ اتنا نکل آیا
زمیں تھی سخت پھر بھی خاک سے پودا نکل آیا

کسی کی تشنگی یادوں میں اُبھری مضطرب کر کے
پھر اس کے بعد پانی سے کوئی پیاسا نکل آیا

ہوئی پہچان اس کی گم حدودِ بحر میں آ کر
بیابانوں سے ہٹ کر جس طرف دریا نکل آیا

سوا اس کے نہ تھی صورت اذیّت ختم ہونے کی
سہی تکلیف سوزن کی مگر کانٹا نکل آیا

ملے تھے چارہ گر سے ہم کہ معمولی خراشیں ہیں
اُڑے ہوش اس کے گھاؤ اس قدر گہرا نکل آیا

شرائط نے حریفوں میں اُبھارے اختلاف ایسے
گلے ملنے سے پہلے صلح پر جھگڑا نکل آیا

فضا گلزار بارش نے بھی تھوڑی دیر بدلی تھی
جب اُترا سیل نیچے سے وہی صحرا نکل آیا

گلزار بخاری

غزل

ملنا جلنا کیا ہے، وقت گزاری ہے
رشتہ نہیں ہے آپ سے رشتہ داری ہے

آئے تو کیسے آئے لہجوں میں مٹھاس
گھروں کے پانی کی تاثیر ہی کھاری ہے

آپ نے جو میرے آنگن میں پھینکا ہے
چھوٹا سا یہ پتھر کتنا بھاری ہے

ماتم و گریہ ہی تو رسمِ فغاں نہیں
چپ ہو جانا بھی تو آہ و زاری ہے

لمحہ لمحہ رشتوں کی آلودگی میں
سانس لیے جانا بھی اک بیماری ہے

اُس میں ضرور کوئی ٹیڑھا پن بھی ہوگا
جس نے یہ ٹیڑھی دیوار اُساری ہے

ہر اک شکاری سبکتگین نہیں ہوتا
ماں کی ممتا کسی کسی کو پیاری ہے

جس کا نام ''محبت'' رکھا دنیا نے
مرے قبیلے میں یہ ''کاروکاری'' ہے

یہی ملا ہے راتوں کی لاحاصلی سے
خواب ہمارے ہیں، نہ نیند ہماری ہے

شاخوں نے بھی پتے پہن لیے جاناں!
مرے نصیب میں کب تک نجم شماری ہے

کب ٹوٹے گا یہ افسونِ شبِ کہف
کیسی نیند ہے جو قرنوں سے طاری ہے

وقت کی دُھند میں دُھندلایا دُھندلایا سا
یہ تو اپنا یار انیس انصاری ہے

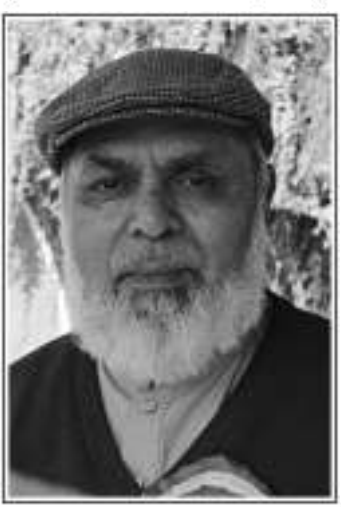

محمد انیس انصاری

غزل

یار آئنہ بھی ٹوٹ کے بے آبرو ہوا
یہ کون شخص آئنے سے دو بدو ہوا

انصاف قتل ہو گیا منصف کے ہاتھ سے
مجرم کسی کے خون سے جب باوضو ہوا

وہ رہنما نہیں ہے فقط جونک ہی تو ہے
لوگوں کا خون چوس کے وہ سرخرو ہوا

دنیا جہاں کی وسعتیں دامن میں آ گریں
میں اک طرف جو ہو گیا تو چار سو ہوا

بے اختیار ہو گیا گل اختیار میں
پھیلاؤ ایک خوشبو کا پھر چار سو ہوا

ردعمل سے روکا تھا میں نے بھی سعدؔ کو
دیکھا پھر اس کا وقت بھی نذر عدو ہوا

سعد اللہ شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ شام چاند تھا خالد تو صبح سورج تھا
مرے فلک سے نہ اترا فراق کا تارا

غزل

پیاسی ریت کے آئینے میں پانی ڈھونڈ رہے ہیں
اک ذرے میں گم گشتہ حیرانی ڈھونڈ رہے ہیں

اک انجانی صورت میں، کیا اپنا پن دیکھا تھا
اب ہم پھر سے اک صورت انجانی ڈھونڈ رہے ہیں

جانے کیا ہے، اس دروازے کے پیچھے کی دنیا
سارے دیدہ وراس کی دربانی ڈھونڈ رہے ہیں

ایک چراغ کی لَو کو رات گئے تک چومنے والے
اپنے لہو میں پہلی سی طغیانی ڈھونڈ رہے ہیں

کیسے دشت کھلے گا اِن پر، کیسے خار کھلیں گے
باہر سے جو اندر کی ویرانی ڈھونڈ رہے ہیں

راہ میں روشن آنکھوں والا کوئی ملے تو کہنا!
ہم تاریک زمانوں میں تابانی ڈھونڈ رہے ہیں

کارِ جہاں اور کارِ محبت ساتھ نہیں چل سکتے
ہم دونوں میں جینے کی آسانی ڈھونڈ رہے ہیں

اطہرؔ ہم نے خوابوں کا زر، آنکھوں آنکھوں بویا
اور اب شہر کے لوگ ہمارا ثانی ڈھونڈ رہے ہیں

ممتاز اطہر

غزل

ہنسی کے پیچھے خوشی نہیں ہے
میں زندہ ہوں ، زندگی نہیں ہے

بہت ہیں احباب اور اقارب
زیادتی کی کمی نہیں ہے

بس ایک بازو چمک رہا ہے
یہ روشنی روشنی نہیں ہے

کوئی بھی اپنا نہیں یہاں پر
یہی نہیں کہ وہی نہیں ہے

کسی کے بس میں نہیں ہے رکنا
گھڑی کے بس میں گھڑی نہیں ہے

بجا کہ لمحے گزر رہے ہیں
یہ زندگی دوسری نہیں ہے

نہ تہہ میں پہنچی نہ پار اتری
ہماری ناؤ رکی نہیں ہے

ابھی ہیں آنکھوں میں خواب باقی
فریب یہ آخری نہیں ہے

شاہنواز زیدی

غزل

سفر ہے ، ہم سفر کوئی نہیں ہے
عطائے بال و پر کوئی نہیں ہے

تری آنکھوں میں کتنے رت جگے ہیں
تجھے اِس کی خبر کوئی نہیں ہے

نہیں جائے اماں سرکار کوئی
بہ ظاہر دربدر کوئی نہیں ہے

مرا بچہ مجھے کہنے لگا ہے
چلوں کیسے ڈگر کوئی نہیں ہے

دفورِ عکس ہے پہروں مقابل
کہاں بارِ دِگر کوئی نہیں ہے

سبھی ہیں غیر کی جادوگری میں
یہاں اپنا ہنر کوئی نہیں ہے

شار ترابی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے حالات مجھ کو چُھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

غزل

گلشن سے بہاروں کا گزر یاد رہے گا
چاہت کا ملا ہے جو ثمر یاد رہے گا

بچ نکلا ہے احساس کی اک موجِ بلا سے
اس دل کے سفینے کو بھنور یاد رہے گا

جس نے مجھے احساس کی دولت سے نوازا
وہ شخص مجھے شام و سحر یاد رہے گا

سر چشمہء آرام گھنی چھاؤں تھی جس کی
وہ گاؤں کا اک بوڑھا شجر یاد رہے گا

گو آج ہیں ندی کے کناروں کی طرح ہم
اک ساتھ کیا تھا جو سفر یاد رہے گا

دیتا تھا دعائیں جو ہر اک دشمنِ جاں کو
ہر دور میں وہ اہلِ ہنر یاد رہے گا

اقبال کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے سب نے
احباب کا یہ حسنِ نظر یاد رہے گا

اقبال سروبہ

غزل

مرے، سبب سے بہت دکھ اٹھا لئے تم نے
برا کیا، جو، مراسم، بڑھا لئے تم نے

تمہیں تو زندگی کرنے کا تجربہ بھی نہیں
دیے ہواؤں میں کیسے جلا لئے تم نے

اب ایک عمر مجھے ڈھونڈنا پڑے گا تمہیں
مرے بغیر زمانے بنا لئے تم نے

کٹھن پڑا ہے بہت آج ہم کو چپ رہنا
ہمارے حوصلے شاید چرا لئے تم نے

تم اپنی آنکھوں کا کچھ تو خیال کر لیتی
یہ واہمے تو مرے تھے سجا لئے تم نے

ہم، اپنے ہونے کی تحریک کو کہاں لے جائیں
تمام زاویے اپنے چھپا لئے تم نے

مجھے بتاؤ تو کیا سوچ کھا رہی ہے تمہیں
ذرا سی عمر میں ہی لب سکھا لئے تم نے

عجیب چیز ہو تم بھی کہ پل جھپکتے ہی
تمام عمر کے جھگڑے چکا لئے تم نے

ابھی، تو، جانا ہے محسنؔ حضورِ دوست تمہیں
ابھی سے کیوں لب و عارض بجھا لئے تم نے

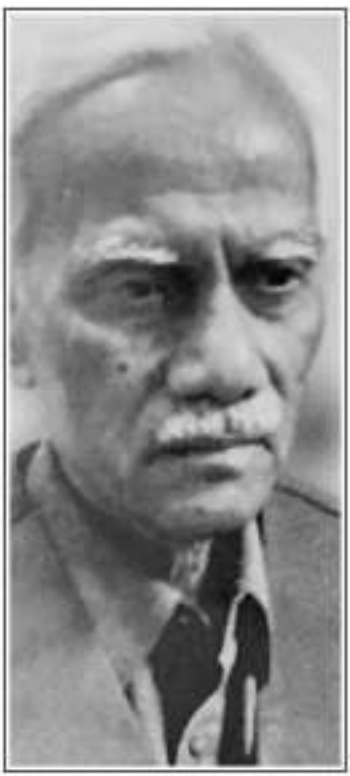

محسن اسرار

غزل

بھڑکتی آگ سے آخر اٹھایا نم میں نے
پھر اس کی لو میں کیا رقص کوئی دم میں نے

یہی کہ چاہا کسی کو اور اس کو پا بھی لیا
لیا ہے کام محبت سے کتنا کم میں نے

بجا ہے آپ جو کہتے ہیں، یہ کہا ہوتا
یہی کہا تھا اسے میرے محترم میں نے

میں کیا بتاؤں گا تاخیر کا سبب اس کو
لیا نہیں ہے کہیں راستے میں دم میں نے

یہ اور بات بھرا ہے بدن میں سانس کے ساتھ
کیا ہے کچھ تو فضا سے غبار کم میں

یہ رات ہجر کی تم پر بھی آئی ہو گی ضرور
بدل دیے ہیں مگر معنیِ عدم میں نے

احمد حسین مجاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا، دیکھ کر گزر جاؤں

غزل

روشنی کے نِصاب جاگتے ہیں
سارے اہلِ کتاب جاگتے ہیں

یہ ستارے ہیں مِیت بچپن کے
سب کا سانجھا عذاب ، جاگتے ہیں

تیرے قُرب و جوار کے اکثر
دل کی آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں

کوئی پُوچھے تو کچھ کہوں میں بھی
لب پہ کتنے جواب جاگتے ہیں

کتنا رہتا ہوں اپنے اندر سے
دل میں کچھ اضطراب جاگتے ہیں

روشنی کا سُراغ کس کو دُوں
رُوح میں ماہتاب جاگتے ہیں

رات پڑتی ہے اوس کلیوں پر
صُبح دم کچھ گُلاب جاگتے ہیں

ایک مدّت سے رات بھر تابش
تیری قُربت کے خواب جاگتے ہیں

تابش کمال

غزلیں

اس طرح زخم پر شباب آیا
جس طرح ، شاخ پر گلاب آیا

بخش دے شرف میزبانی کا
فاختاؤں کے گھر عقاب آیا

اس کو مٹی میں دفن کر دوں گا
راستے میں اگر چناب آیا

پہلے تو حکمران آتے رہے
اور پھر ایک دن عذاب آیا

ہے زمیں بھی پرانے قصوں میں
اک جزیرہ تھا زیرِ آب آیا

دن نکلتا کسی نے دیکھا ہے
کیا کسی گھر میں آفتاب آیا

یاد آنے میں کیا قباحت تھی
یاد آیا تو بے حساب آیا

مسعود احمد

کب سے دہک رہا تھا بدن کے تنور میں
گلزار ہو گیا ہوں محبت کے نور میں

سیدھا ہے آسمان سے رستہ زمین کا
اٹکا دیا گیا ہے ہمیں پھر کھجور میں

ہے بادی النظر میں کوئی اور سلسلہ
مضمون کوئی اور ہے بین السطور میں

رخسار و لب وہ سرخ گلابوں کی ڈالیاں
دیکھا اسے ہے چاند ستاروں کے نور میں

آتا نہیں شجر پہ کبھی پھل جھکے بغیر
کچھ عاجزی ملانی پڑے گی غرور میں

بے ساختہ کہا یہ فرشتوں نے دیکھ کر
ایسا جمال ہے کسی جنت کی حور میں

یہ آئیں بائیں شائیں بھلا کتنی دیر تک
ہونا پڑے گا پیش خدا کے حضور میں

مسعود بار بار ملانا پڑا ہمیں
نیت کا یہ فتور بھی دل کے فتور میں

غزل

افروز رضوی

جلتے ہوئے دیپک کو ہواؤں پہ رکھا ہے
خواہش کو تری میں نے ، صداؤں پہ رکھا ہے

جس میں مرے دل کو تھی محبت ترے دل سے
تو نے وہ تعلق بھی اناؤں پہ رکھا ہے

اس میری زمیں پر تو ہمیشہ سے فلک نے
جس شے کو رکھا اپنی رضاؤں پہ رکھا ہے

بے وجہ برستی ہیں سمندر پہ یہ اکثر
بادل نے یہ الزام گھٹاؤں پہ رکھا ہے

گو کھیلنے والے تو بہت لوگ یہاں ہیں
اس دل نے بھروسہ تو وفاؤں پہ رکھا ہے

ان تیز ہواؤں میں بھی افروز ہمیشہ
چاہت کا دیا میں نے ہواؤں پہ رکھا ہے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

رخشندہ نوید

گریہ و ماتم آنکھوں کا
دم دما دم دم آنکھوں کا

صحرا ناپتے ناپتے نکلے
روز و شب ہم آنکھوں کا

عارض دونوں پی جاتے ہیں
رہا سہا نم آنکھوں کا

کوئی کوئی پڑھ سکتا ہے
تحریری غم آنکھوں کا

طوفانوں کو کھینچ نہ لائے
یہ زیر و بم آنکھوں کا

غصہ دل میں رہے تو کیا
غصہ ہو کم آنکھوں کا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بھری رکھنا ، مرے مولا ، یہ آنکھیں
دُکھوں کی بارشوں کا مان رکھنا

غزل

ترے جمال سے، میرے خیال تک نہ ملا
ہمارے بیچ کوئی رنگ مشترک نہ ملا

کسی کی گمرہی بھی رہبری شمار ہوئی
کسی کے کارِ امامت کو نام تک نہ ملا

یہی وہ خواب تھا جو زندگی کا حاصل ہے
اب ایسا کر کہ پلک سے کبھی پلک نہ ملا

یقین کر میں کسی اور کی امانت ہوں
مرے مشام میں اپنی کوئی مہک نہ مِلا

ہزار یُگ سے یہ اک پل کی زندگی بہتر
کہ اشک بن کے پلک پر مجھے چمکنا مِلا

کرن کرن سے ملی، نور کا جھماکا ہوا
پراس کے بعد ہمارا نشان تک نہ ملا

اک ایک آنکھ نے دیکھا ہے تیری دید کا خواب
اک ایک دل کو ترے عشق میں دھڑکنا ملا

رحمان حفیظ

غزل

احمد سبحانی آکاش

حُسن ہو، ہوش نہ چھینے یہ ہوا ہی کب ہے
عشق ہونے پہ کوئی اپنا رہا ہی کب ہے

ایک ہی نام ہے دھڑکن کو تسلسل کے لیے
دوسرا ذکر کبھی دل نے کیا ہی کب ہے

جانتا ہے وہ مری شوخ نگاہی کی طلب
اختیار اُس نے مجھے سارا دیا ہی کب ہے

ہر عمل اپنی جگہ ردِعمل ٹھہرا کرا!
خود پہ الزام کوئی اُس نے لیا ہی کب ہے

وہ تو آنکھیں ہی دغا باز نکل آتی ہیں
ورنہ، احوال اُسے اپنا کہا ہی کب ہے

بھول کر خود کو اُسے چاہنا بنتا ہے میاں
صرف خواہش سے، کسی پر وہ کھلا ہی کب ہے

اُس سے ملنے کے طریقوں میں اضافے کے سوا
مشورہ اور کوئی میں نے سُنا ہی کب ہے

سلسلہ وار چراغاں ہے فلک تا بہ فلک
اُس کی جانب سے فقط ایک گواہی کب ہے

غزلیں

کوئی ایسا ، کوئی ویسا ، کوئی کیسا سمجھے
ہم اسیرانِ محبت کو نہ دنیا سمجھے

ہم جو سمجھے تو تری بزم میں اتنا سمجھے
خود کو ہر کوئی ، ترے عشق میں ، رسوا سمجھے

ہے تری یاد کا اعجاز، بچھڑ کر تجھ سے
ہو کے تنہا بھی کوئی ، خود کو نہ تنہا سمجھے

سانحہ جس پہ گزرتا ہے ، وہی جانتا ہے
تشنگی دشت کی ، ممکن نہیں دریا سمجھے

ایک وہ ہے کہ کسی طور ہمارا نہ ہوا
ایک ہم ہیں کہ اسے پیار میں کیا کیا سمجھے

اس میں ہرگز ہی نہیں اپنی طبیعت کا قصور
جس نے جیسا ہمیں سمجھا، اسے ویسا سمجھے

اس کو سمجھے گا بھلا کون مسیحا ، شوکت
ہم سے بیمار محبت کو جو اچھا سمجھے

شوکت محمود شوکت

سمجھ آئی نہیں جن کو وفا کی ، پیار کی باتیں
کریں گے کس طرح پھر وہ، لب و رخسار کی باتیں

جہانِ آب و گل پر جانے چھائی ہے فضا کیسی
کہ کرتے ہیں سبھی اب تو، رسن کی، دار کی باتیں

خزاں کا دور دورہ ہے ، عنادل محوِ گریہ ہیں
خیال و خواب ہیں گویا، گل و گل زار کی باتیں

دلِ برباد کو دنیا سے رغبت کیا نہیں باقی ؟
ہوئی مدت کہ کرتا ہی نہیں دل دار کی باتیں

کہاں ہیں وہ ، جو ہوتے تھے تمھاری بزم کی رونق
کہاں ہیں وہ، جو کرتے تھے جمالِ یار کی باتیں

نہیں چھیڑیں، کسی صورت بھی یکسر عشق بازی میں
وہ باتیں جیت کی ہوں یا کہ ہوں وہ ہار کی باتیں

اِدھر سے فاختہ کی چونچ میں زیتون کی ٹہنی
اُدھر زوروں پہ ہیں شوکت، نئے ہتھیار کی باتیں

غزل

میں رابطوں کو ہمیشہ بحال رکھتا ہوں
ان آبگینوں کا ہر دم خیال رکھتا ہوں

عجب ہی کیا ہے جو تحسین اسکی ہوتی ہے
میں ہر غزل میں تمہارا جمال رکھتا ہوں

ہر ایک رت میں بھرم رکھتا ہوں بہاروں کا
میں زردیوں میں بھی بادِ شمال رکھتا ہوں

تلاشِ چارہ گراں میں عبث بھٹکتے ہو
تمھارے درد کا میں اندمال رکھتا ہوں

وہ تیری یاد کے منظر ہوں یا خطوط ترے
میں یہ اثاثے ہمیشہ سنبھال رکھتا ہوں

ملن رتوں میں بھی مجھ کو یہ خوف رہتا ہے
بچھڑ نہ جائے کہیں وہ ملال رکھتا ہوں

یہ عجز میرا تفاخر ہے، اس پہ نازاں ہوں
میں انکسار میں اپنی مثال رکھتا ہوں

کسی نے آنے کا وعدہ کیا ہو پھر تو جلیل
اجل بھی آئے تو میں اس کو ٹال رکھتا ہوں

احمد جلیل

غزل

بدلا بدلا نظر آتا ہے سماں میرے بعد
تم مجھے یاد کرو گے مری جاں میرے بعد

کون کہتا ہے کہ ہونٹوں پہ لگے ہیں تالے
چوٹ گہری ہے یہ کھولیں گے زباں میرے بعد

اب رہے گی یہ کرپشن، نہ بدامنی یارو
ایک اک کر کے مٹیں گے یہ نشاں میرے بعد

ہجر کی رات تجھے ساتھ نہ کیوں لے جاؤں
یوں بھٹکتی ہی پھرے گی تُو کہاں میرے بعد

اک نئے عزم سے اٹھو کہ نیا سال آیا
پھر سے آباد کرو ایک جہاں میرے بعد

مٹ گیا عشق میں اب کون کرے گا نیّر
نالۂ نیم شبی، آہ و فغاں میرے بعد

نیّر سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وقت کے ساتھ تقاضوں کو بدل جانا تھا
تجھ کو اے صبحِ ستم! شام کو ڈھل جانا تھا

غزل

رُخصت کے وقت آنکھیں ہماری جو نم نہیں
کیا ہم کو تیرے جانے کا کوئی بھی غم نہیں ؟

تصویر اُن کی رہتی ہے آنکھوں کے سامنے
ہجراں تو میرے واسطے وجہِ الم نہیں

شیطاں کو شرم آتی ہے انساں کو دیکھ کر
رہبر ملے جو ہم کو وہ شیطاں سے کم نہیں

پیشِ یزیدِ وقت یہ گردن نہ جُھک سکی
کٹنے کے بعد بھی مری گردن میں خم نہیں

تختِ شہی سے تختۂ دار و رسن پہ ہیں
ہم جس مقام پر تھے، وہاں اب کے ہم نہیں

رندانِ تشنہ کام ، قیامت کی ہے گھڑی
جامِ سفال بھی نہیں اور جامِ جم نہیں

دستِ ستم کو توڑتے مقصود جعفری
تیغِ ستم کو توڑیں اب اتنا بھی دم نہیں

مقصود جعفری

غزل

صدیوں کا سفر جیسے ہو جینیات میں شامل
پُرکھوں کا چلن ہے مری عادات میں شامل

اک شور سا رہتا ہے بپا عالمِ کُن میں
پھر دھیرے سے ہو جاتا ہے دن رات میں شامل

ان فرش نشینوں سے عقیدت جو ہے مجھ کو
ہے چاک کی مٹی مری اوقات میں شامل

میں عرش نشیں ہوتی ہوں تیرے ہی کرم سے
تجھ ذات کا پرتَو ہے مری ذات میں شامل

کچھ بھی تو نہیں تیری محبت کے سوا میں
ہے تیری عطا میری کرامات میں شامل

شبہ طراز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر ایک رات تری صبح سے عبارت ہو
کتابِ عمر میں اِک باب کا اعادہ رہے

غزل

کہیں سر پر گراں نہ ہو جائے
یہ زمیں آسماں نہ ہو جائے

ڈر رہا ہوں میں تجھ سے ملتے ہوئے
تُو کہیں مہرباں نہ ہو جائے

جیسے ٹوٹا ہے آئنے میں عکس
وہ ہی دل کا سماں نہ ہو جائے

اِس قدر ہجر ہائے اتنا ہجر!
یہ ہی میرا بیاں نہ ہو جائے

خامشی اِس قدر کہ ڈرتا ہوں
ہر مکاں ، لامکاں نہ ہو جائے

یہ ملاقات کا جو اِک پَل ہے
دیکھنا جاوداں نہ ہو جائے

بول اُٹھا ہوں کہ میری خاموشی
کہیں تجھ پر گراں نہ ہو جائے

اتنی غفلت کہ ایک خوف سا ہے
قافلہ بے نشاں نہ ہو جائے

کسی پہلو بھی یہ ٹھہرتا نہیں
دل رگوں میں رواں نہ ہو جائے

زخم کو زخم ہی نبیل سمجھ
داغ جب تک عیاں نہ ہو جائے

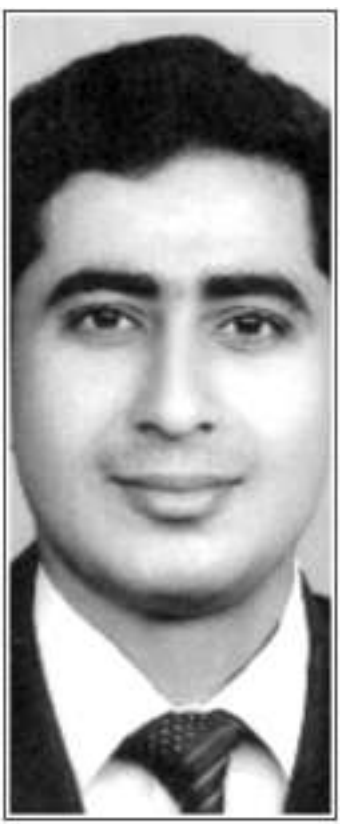

نبیل احمد نبیل

غزلیں

امکان سے آگے کی طرف دیکھ رہا ہوں
اک عمر سے میں اپنا ہدف دیکھ رہا ہوں

چھپ کر بھی کرے وار تو اوجھل نہیں ہوتا
اے دشمنِ جاں تیری طرف دیکھ رہا ہوں

اب اس کے خد و خال نظر آنے لگے ہیں
مُدّت سے اندھیرے کی طرف دیکھ رہا ہوں

ترتیب میں سب اپنے بزرگوں سے الگ ہیں
بچّوں کی بنائی ہوئی صف دیکھ رہا ہوں

آرائشِ ہستی سے لگاؤ نہیں جاتا
دُنیا میں ترے سارے شغف دیکھ رہا ہوں

لگتا ہے مدینے کا سفر میں نے کیا ہے
ہاتھوں میں ہر اک طفل کے دف دیکھ رہا ہوں

آیا ہوں کسی جنگ کے میداں سے گزر کر
ہر شخص کو شمشیر بکف دیکھ رہا ہوں

محمد نوید مرزا

زمیں پر جب نئے قانون آئے
کہیں موسیٰ کہیں فرعون آئے

نئی رُت کا تقاضا تو یہی ہے
دسمبر میں کسی دن خُون آئے

تہی دستوں کی خواہش بھی ہو پُوری
خزانہ لے کے خود قارون آئے

میں سارے شہر کے زخموں کو بھر دوں
مری آنکھوں میں اتنا خون آئے

بتانا چاہتا ہوں کرب اپنے
مرے شعروں میں ہر مضمون آئے

وبائیں پھوٹتی ہی جا رہی ہیں
نہ جانے کب یہاں طاعون آئے

خمیدہ سر ہیں سب ظلِ الٰہی
کبھی ہم سب بھی تھے ممنون آئے

غزل

جِس کی خاطر خُود کو بُھوکا رکھا تھا
اُس نے اپنے آگے پِیزا رکھا تھا

سارا دن وہ اُس کو چُوری ڈالتی تھی
اس نے رانجھے نام کا طوطا رکھا تھا

اُس کے گھر میں سب چیزیں ترتیب سے تھیں
بس میری تصویر کو اُلٹا رکھا تھا

میں نے سارا دن بس فِلمیں دیکھی تھیں
کھانا کیسے کھاتا؟ روزہ رکھا تھا

میں بھی ساری کڑوی باتیں بُھول گیا
اُس نے بھی کھانے میں مِیٹھا رکھا تھا

جِس کے دم سے رونق تھی ہر محفل میں
اُس نے اپنے آپ کو تنہا رکھا تھا

کیفی اس کی آنکھیں ہی بتلا دیں گی
اُس نے دل میں مُجھ کو کِتنا رکھا تھا ؟

محمود کیفی

غزل

ہم جو جنت سے نکالے گئے فتنہ کرتے
حکم تیرا ہے تو لوٹ آئیں گے سجدہ کرتے

معرکہ عشق کی حرمت کا ہو یا بدر کا ہو
حالتِ جنگ میں رشتے نہیں دیکھا کرتے

ہم نہ ہوتے تو کوئی اور محبت کرتا
تُو نہ ہوتا بھی تو ہم تیری تمنا کرتے

تیرے دیدار کے لمحات بہت قیمتی تھے
ہم اگر آنکھ جھپکتے تو خسارا کرتے

اب تجھے روز نہ سوچوں تو بدن ٹوٹتا ہے
عمر گزری ہے تری یاد کا نشہ کرتے

جانے والوں کو صدائیں نہیں دیتے ساگر
اشک واپس نہیں آنکھوں میں سمایا کرتے

محمد سلیم ساگر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ رنگ آنکھ میں ڈوروں کی طرح پھیل گیا
چھلک چھلک کے جو پوروں تک آ گیا آخر

غزل

آنکھ سے نکلا اک اشارہ سمجھ
تیرگی میں چمکتا تارہ سمجھ

زندگی ہے رواں دواں ہر پل
موج دریا ہے ،مت کنارہ سمجھ

سنگ آئے اسے عدو کا جان
پھول آئے اسے ہمارا سمجھ

جو بھی ابھرا ہے ڈوبنا ہے اسے
شام خورشید کا نظارہ سمجھ

یہ اندھیرے میں منہ چھپاتا ہے
اپنے سائے کو مت سہارا سمجھ

روشنی سب لٹا چکا اجمل
ٹوٹنے والا اک ستارہ سمجھ

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ بھی شور ہے، چیخیں بھی لویں ہیں خالد
سُر ملے یا نہ ملے 'روم' تو جل جانا تھا

غزل

ہم اِس لئے بھی زیادہ ہیں آشنائے غزل
ہمارے شہر میں بنتی رہی قبائے غزل

جسے غزل کا نہیں ہے جنوں خموش رہے
جسے غزل کا جنوں ہے وہی سنائے غزل

میں دے رہا ہوں زمانے کو مشورے، لیکن
کہی ہے میں نے بھی اکثر غزل برائے غزل

ترا جمال دکھاتا ہے راستے سارے
ترے بغیر نہ میری سمجھ میں آئے غزل

ملی ہے میر کے دولت کدے سے بھیک مجھے
سدا فقیر پہ راضی رہے خدائے غزل

مرے قلم سے قصیدے نہیں لکھے جاتے
نہ بزمِ شاہ میں جاتا ہے یہ گدائے غزل

خدا کرے کہ شہیدوں میں نام آ جائے
میں جا رہا ہوں بُلاتی ہے کربلائے غزل

ہمارے سامنے سارا عمل ہوا ہے میاں
ہمارے سامنے رکھی گئی بنائے غزل

جدا جدا ہیں ہمارے مُعاملے انصر
اُسے ہے نظم کا رونا، مجھے ستائے غزل

انصر حسن

غزل

اجازت ہے؟ سجالوں محفلِ یاراں! اجازت ہے؟
مثالوں میں اگر ساقی، غمِ جاناں، اجازت ہے؟

حسیں زلفیں پریشاں ہیں، اجازت ہو، تو سلجھادوں؟
وہ جھجکے، مسکرائے، پھر کہا! ہاں ہاں! اجازت ہے

چلو سب مے کشو! آؤ! اسی کے شہر چلتے ہیں
وہاں اس کی حکومت ہے، سنا ہے، واں اجازت ہے

فقط اک بار ہمت کی، کہا! پہلو میں آ بیٹھوں؟
وہ اترائے، وہ شرمائے، کہا! کیا یاں، اجازت ہے؟

تمہیں اب سب اجازت ہے، جو جی چاہے وہ کرلو تم
تمہیں آزاد کرتے ہیں دلِ ناداں اجازت ہے

محبت میں مجھے سب کچھ نچھاور کر کے جانا ہے
میں حاضر ہوں، مجھے کردو تہی داماں، اجازت ہے!

تری شوریدگی تجھ کو یہاں رہنے کہاں دے گی
چلا جا! ریگزاروں میں، اٹھا ساماں! اجازت ہے!

محبت ہے، محبت ہے، محبت ہے، محبت ہے
کتابِ زندگی کو دوں میں یہ عنواں، اجازت ہے؟

سنا ہے اب، محبت نے، تمہیں یکسر بدل ڈالا؟
جو جی چاہے وہ کرتے ہو، تمہیں چنداں اجازت ہے؟

عجب الجھن رہی دانش! اگرچہ ساتھ تھے دونوں
چلو اچھا! نہیں چھوڑو! ارے! ناں ناں! اجازت ہے!!

دانش عزیز

غزلیں

میں کسی بھی حدِ اخلاق کا پابند نہ تھا
میری پوشاک میں جب ٹاٹ کا پیوند نہ تھا

میں نے سو بار ہتھیلی پہ جمائی سرسوں
میری بیعت پہ مگر کوئی رضا مند نہ تھا

اس قدر میل نہ دیکھا تھا کبھی سینوں میں
اس قدر پہلے دماغوں میں کبھی گند نہ تھا

عشق مذہب تھا مرا حسن تھا مسلک جب تک
آنکھ پتھرائی نہ تھی سینہ مرا بند نہ تھا

اور مرے بعد بھی ایسا کوئی امکان نہیں
مجھ سے پہلے بھی یہاں کوئی ہنر مند نہ تھا

اب بھی اس جذبۂ ایثار پہ حیران ہیں لوگ
سامنے حکم کی تعمیل تھی فرزند نہ تھا

اس قدر بات نہ بگڑی تھی جہاں سے قاسم
اس طرح ذات کے محبس میں نظر بند نہ تھا

جاوید قاسم

اس قدر تلخ ترے عہد نے ایام کیے
ہم نے تو ہجر کے موسم میں بھی سو کام کیے

فکر و افکار کی تہذیب کو مرنے نہ دیا
نارِ نمرود میں جل جل کے سخن عام کیے

موج میں آتے ہیں بے دار زمانے جن سے
ہم نے وہ جاگتے لمحے بھی ترے نام کیے

جن کا ہر سانس تھا تسبیح کے دانوں جیسا
تم نے وہ باوصفت لوگ بھی بدنام کیے

پھر بھی بدلا نہ گیا ضابطۂ درد فراق
سو ترامیم بھی کیں سیکڑوں اقدام کیے

اب بھی سینے سے لگا رکھے ہیں بچوں کی طرح
تم نے جو درد دیے زخم جو انعام کیے

کتنے سالوں سے مسلسل ہوں سفر میں قاسم
مدتیں بیت گئیں اک ذرا آرام کیے

غزل

ہمارے بیچ عداوت پڑے گی زُلف بدوش
دلوں میں گر نہ محبت پڑے گی زلف بدوش

بکھیرتی ہی چلی جائیں ، سیہ فام لٹیں
اِسی سے عشق کی عادت پڑے گی زلف بدوش

کسی کے لفظِ محبت کو گر کیا نہ قبول
تو دل پہ خوب نحوست پڑے گی زلف بدوش

مرا ہی عکس ملے گا ہر ایک دُھند کے پار
مجھی پہ چشمِ عنایت پڑے گی زلف بدوش

میں تھام لوں گا اسی وقت ہاتھ ہاتھوں میں
کوئی جو تجھ پہ مصیبت پڑے گی زلف بدوش

جو بزمِ دل ہے وہاں بے دھڑک نہیں جاتے
وہاں بھی لینی اجازت پڑے گی زلف بدوش

نہ آفتابِ محبت سے یوں بچا پہلو
تجھے اسی کی ضرورت پڑے گی زلف بدوش

آفتاب خان

غزلیں

جب دوا کر نہ سکے ہم تو دعا دے آئے
اب یہ لگتا ہے کہ شعلوں کو ہوا دے آئے

اک کسک بن کے کھٹکتا ہی چلا جاتا ہے
جھوٹ کی بھیڑ میں جو لفظ کھرا دے آئے

پیار کے بول پہ دی جان تہی دستوں نے
جتنی توفیق تھی اتنی تو جزا دے آئے

سب ہی راضی برضا ہو کے جیئے جاتے تھے
اپنے حصے کی مگر ہم تو صدا دے آئے

اب تعاقب میں ہے دریا کی روانی روشن
برف شہروں میں صدا سب سے جُدا دے آئے

اعجاز روشن

پوچھ لے وہ جو حال اندر کا
رابطہ ہو بحال اندر کا

عشق ہے نام خود سے دوری کا
ہجر سے ہے وصال اندر کا

بالا بالا سی گفتگو ہو جہاں
کون پوچھے سوال اندر کا

وہ رہی ٹوکری سیاست کی
گند سارا اُچھال اندر کا

فن سے عاری یہی سمجھتے ہیں
شاعری ہے وبال اندر کا

جب گرہ سال کو لگے باہر
چھوٹ جاتا ہے سال اندر کا

کیسی رونق ہے شہر کی روشن
مر رہا ہے غزال اندر کا

غزل

مری زمیں پہ نیا آسمان کرتا ہے
یوں میرے سر پہ گھنا سائبان کرتا ہے

وہ بولنے کی اجازت مجھے نہیں دیتا
کبھی وہ میری زباں میں بیان کرتا ہے

میں تیرے دھیان سے غافل نہیں رہا لیکن
مرا گمان مجھے بدگمان کرتا ہے

ترے خیال کو میں ساتھ ساتھ رکھتا ہوں
کہ جیسے میری حفاظت مکان کرتا ہے

میں اپنے شعر سے کرتا ہوں اس طرح الفت
زمیں سے جیسے محبت کسان کرتا ہے

میں اس پہ اپنی محبت نثار کرتا ہوں
وہ درد و رنج و الم مجھ کو دان کرتا ہے

ہمیں تو اس کے علاوہ بھی کام ہیں دانش
یہ کارِ عشق تو سارا جہان کرتا ہے

اعجاز دانش

غزل

بدگمانی کی اونچائیاں دیر تک
دل کو دیتی رہیں کھائیاں دیر تک

اس کے جسمِ معطر کو چھو کیا لیا
مہکا کی ہیں مری انگلیاں دیر تک

آپ کی اس علاقے سے رخصت کے بعد
سونی سونی رہیں بستیاں دیر تک

دیکھ کر تیرا بدمست جسمِ جواں
کوندا کیں قلب پر بجلیاں دیر تک

میں تو صحرا نما تھا مرے گرد کیوں
رقص کرتی رہیں تتلیاں دیر تک

محفلِ یار پھر بھی نہیں مل سکی
کی گئیں جادہ پیمائیاں دیر تک

ہائے ری مفلسی کہ جواں چہرے کی
دیکھتے رہ گئے جھریاں دیر تک

ہجر کی شب مگر نیند آئی نہیں
یادیں دیتی رہیں تھپکیاں دیر تک

وہ بھی دن کیا بھلے تھے کہ ماں باپ کی
کھاتے رہتے تھے جب جھڑکیاں دیر تک

اے مرے نور پیکر ترے بعد بھی
جگمگاتا رہا آشیاں دیر تک

ذکی طارق

غزل

میری آنکھوں میں اشک تیرے ہیں
غم کے بادل بہت گھنیرے ہیں

تیرگی کا کروں میں کس سے گلا
بس مقدر میں ہی اندھیرے ہیں

شب جدائی کی جس قدر ہو طویل
بعد اس کے تو پھر سویرے ہیں

خود کو ہر پل بچا کے رکھنا دوست
شہر میں ہر طرف لٹیرے ہیں

آ گئی راس مجھ کو ویرانی
شہر سے دور اب بسیرے ہیں

میں حقیر و فقیر و پر تقصیر
سارے احسان مجھ پہ تیرے ہیں

ہے تو یہ اک غزل مگر اشفاق
ریزہ ہائے خیال میرے ہیں

محمد اشفاق بیگ

غزل

یہ جو اس کی گلی سی لگتی ہے
ہر قدم شاعری سی لگتی ہے

اس لیے اس کے پاس آتا ہوں
وہ مجھے زندگی سی لگتی ہے

گرچہ کوئی کمی نہیں، لیکن
پھر بھی کوئی کمی سی لگتی ہے

ہو نہ ہو اس کا نقشِ پا ہو گا
یہ جو کچھ روشنی سی لگتی ہے

اس سے ملنے کے بعد جانے کیوں
ساری دنیا نئی سی لگتی ہے

ہر ورق پر لکھا ہے نام اس کا
زندگی ڈائری سی لگتی ہے

اڑتے دیکھا نہیں اسے شوکت
پھر بھی کوئی پری سی لگتی ہے

افتخار شوکت

غزل

کعبہ گُم ہوجاتا ہے بتخانہ گُم ہوجاتا ہے
میری حقیقت میں ہراک افسانہ گُم ہوجاتا ہے

اپنی غزل کی انگلی پکڑ کر دُور نکل جاتا ہوں میں
ایک غزال کی آنکھوں میں ویرانہ گُم ہوجاتا ہے

لے جاتا ہے آخر چوتھی ست مدارِ خطِ سبو
ایک مقامِ قُلقُل پر میخانہ گُم ہوجاتا ہے

چُھپ کر میں روزانہ اپنے دل کا پیچھا کرتا ہوں
تیری گلی میں جا کر یہ روزانہ گُم ہوجاتا ہے

دل میں شرابِ شعورِ درد نہ ہو تو اس کا جواز نہیں
استعمال نہ ہو تو یہ پیمانہ گُم ہوجاتا ہے

میں اس دشت کو باغ بنا کر، پھول اگا کر آیا ہوں
جانِ من جس دشت میں ہر دیوانہ گُم ہوجاتا ہے

وعدۂ وصل کے بدلے جان ادا کر کے یہ راز کھُلا
یہ سودا نہیں ہوتا اور بیعانہ گُم ہوجاتا ہے

لوٹنے لگتی ہے میرے قدموں میں مجھ سے ٹکرا کر
وُہ آندھی جس میں ہرایک ٹھکانہ گُم ہوجاتا ہے

میری کہانی کی طاقت ارمان اُسے معلوم نہیں
اِس جادوئی حقیقت میں افسانہ گُم ہوجاتا ہے

علی ارمان

غزل

گرا پنے بل پہ نہ اٹھیں گے اب گرے ہوئے لوگ
مدد بھی کس سے کریں گے طلب گرے ہوئے لوگ

سحر کو لقمے پہ گرتے ہیں، شب کو بستر پر
گزارتے ہیں عجب روز و شب گرے ہوئے لوگ

میں جب بھی اندھے کنویں سے نکلنے لگتا ہوں
دبوچ لیتے ہیں نیچے کو تب گرے ہوئے لوگ

کوئی نظر کوئی معیار سے گرا ہوا ہے
ہمارے چاروں طرف ہیں عجب گرے ہوئے لوگ

عجیب لگتی ہے ایسے میں خود اٹھان اپنی
جگہ جگہ نظر آتے ہیں جب گرے ہوئے لوگ

گرے جو نظروں سے، مردم شماری ہو ان کی
پتہ چلے کہ ہیں کتنے ارب گرے ہوئے لوگ

اس ایک شخص میں کوئی تو بات ہے آخر
لگے ہیں جس کو گرانے میں سب گرے ہوئے لوگ

خدائے احسنِ تقویم ہی سے پوچھتے ہیں
نکالے جائیں گے پستی سے کب گرے ہوئے لوگ

شاہد ماکلی

غزل

کاش رو کے سے رُکے تُو، تجھے روکوں میں بھی
مجھ سے تُو بات کرے کاش، کہ بولوں میں بھی

ہم سفر! تُو نے بچھڑنے میں بہت جلدی کی
جی تو چاہے کہ ترے ساتھ ہی ہولوں میں بھی

ایسی پتھرائی ہوئی زیست کو، کیا زیست کہوں؟
کوئی آواز نہ دے، مڑ کے نہ دیکھوں میں بھی

موت سے کم تو نہیں تجھ سے بچھڑ کر جینا
وقت اتنا تو مجھے دے دے کہ رولوں میں بھی

جو بھی جاتا ہے خبر تک نہیں دیتا جا کر
ایسا کیا ہے ترے اس پار، یہ دیکھوں میں بھی

اپنے سب خواب مجھے سونپ کے جانے والے
وقت آیا ہے کہ اب خواب سمیٹوں میں بھی

میں بھی چپ چاپ یونہی چھوڑ دوں دنیا! تجھ کو
تُو نے جب کچھ نہیں سوچا، تو نہ سوچوں میں بھی

رانا سعید دوشی

غزلیں

ہمارے دن ، کبھی راتیں ہماری
ہمارے بعد ہیں باتیں ہماری

چراغِ چشم پانی سے ہیں روشن
یہ آنسو ہیں ، کراماتیں ہماری

محبت کا چلن ، مذہب ہمارا !
سراپا عشق ہیں ذاتیں ہماری

برسنا بھول کر ساون بھی دیکھے !
خزاں آنکھوں میں برساتیں ہماری

ہم آوارہ یہاں زنجیر ٹھہرے !
تمہارے اشک ہیں گھاتیں ہماری

ہماری جیت میں رہتی ہیں راجا !
کہیں چُھپ کر کبھی ماتیں ہماری

ظفر علی راجا

مکرر پھر وہی رُداد ٹھہری !
ہزیمت برسرِ بغداد ٹھہری
پرندے دام پر جو آن بیٹھے !
عجب کچھ سازشِ صیاد ٹھہری
کبھی حالات نے ڈھائے مظالم
کبھی قسمت ستم ایجاد ٹھہری
کوئی رستا کہیں اُجڑا ، اچانک !
کوئی منزل کہیں برباد ٹھہری
نہیں کچھ فرق اب دونوں میں باقی
مصیبت اس قدر ہمزاد ٹھہری

ہمیشہ سے غلامی میں ہے ، لیکن !
یہ دنیا ، نام کی ، آزاد ٹھہری
رسائی جب بُہوں تک ہو نہ پائی
کلیجے میں ہر اک فریاد ٹھہری
جو بسنے کے لئے اُجڑی تھی راجا
وہ بستی پھر کہاں آباد ٹھہری؟

غزل

دیتا کوئی مثال کیا اُس حُسنِ بے مثال کی
جس کے لبوں پہ موجزن باتیں ہیں سب کمال کی

میری نظر تو ایک ہی لمحے میں بجھ کے رہ گئی
لاتا میں تاب کس طرح اُس حُسنِ پُر جلال کی

سورج کے ساتھ ساتھ سفر پر ہے گامزن
گھڑیاں تمام آج تک ہجر و وصال کی

لمحہ گزارنا ہے گراں اُس کے ساتھ اب
پر بات ہو رہی ہے یہاں ماہ و سال کی

میری نگاہ میں ہے شب و روز کی جھلک
تاریخ لکھ رہا ہوں عروج و زوال کی

آئندہ بھی نظر میں ہے ماضی بھی روبرو
تفسیر لکھ رہا ہوں حقیقت میں حال کی

دیکھو تو کس قدر حسیں وہ لگ رہی ہے آج کل
آؤ نظر اُتار دیں اُس پیکرِ جمال کی

وہ تو گزر گیا مجھے اُلجھن میں ڈال کر مگر
اُلجھا رہا میں بحث میں بس قیل و قال کی

جو چاہ کر بھی کہہ سکا نہ اُس سے خود ندیمؔ میں
"دل میں خلش ہے آج تک اُس اَن کہے سوال کی"

ریاض ندیم نیازی

غزل

مرے گھر لوٹ کر پھر آ گیا ہے
ستم گر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

کسی کے وصل کی یادیں سمیٹے
دسمبر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

محبت دیکھ اُس کو کھنچ لائی
سخنور لوٹ کر پھر آ گیا ہے

مجھے جو چھوڑ کر آگے بڑھا تھا
برابر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

بڑی مشکل سے تھا جس کو بھلایا
وہ منظر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

دلوں کی دھڑکنیں جس نے چرائیں
وہ دلبر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

فضاؤں میں اُڑا کرتا تھا عابد
زمیں پر لوٹ کر پھر آ گیا ہے

عابد معروف مغل

غزل

جب ذرا شور بن گئی آواز
کان میں تب کہیں پڑی آواز

آبگینوں سے قہقہے اُس کے
پھوٹتی ہے ہنسی خوشی آواز

کون ہو ہم سے ہم کلام، اجی!
کون سُنتا ہے سر پھری آواز

جس کی منزل پہ چُپ کا پہرہ ہے
پھر اُسی راستے چلی آواز

بوجھ آدھا ہوا سماعت کا
دیکھتے دیکھتے سُنی آواز

اُس رفو گر سے حال کہہ دیکھوں
سی سکے گر، کٹی پھٹی آواز

کون تھا حال پوچھنے والا
زخم کی طرح کُھل گئی آواز

بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا
جب سنبھل کر نہ دی، رُندھی آواز

شور بازار میں تماشا تھا
یک رہی تھی وہ قیمتی آواز

سُن دہائی مرے سمیع و بصیر!
دیکھ! تالو سے چِھد گئی آواز

اُس کو چکھا گیا، سُنا نہ گیا
پی گئے لوگ مدھ بھری آواز

چُپ کی دیوار کا سہارا چِھنا
ڈھے گئی پل میں بُھربُھری آواز

فرح رضوی

غزلیں

وہ انتظار کا بس اتنا مجھ کو پھل دے گا
کہ میرے زخم کریدے گا اور چل دے گا

جہان دیکھے گا سب جھوٹ رائیگاں جاتا
گروہ میں سے کوئی ایک سچ اگل دے گا

رجائیت نے مجھے کام پر لگائے رکھا
جو مسئلے بھی ہوئے وقت ان کا حل دے گا

درون دل کو ملا دے گا کائنات کے ساتھ
بدل کے خود کو جو حالات کو بدل دے گا

اسی لیے نہ کیا حال سے جدا فردا
ہمارا حصہ ضرور آج ورنہ کل دے گا

کرے گا فطرتِ انساں سے پیار کیا جاذبؔ
جو پھول جذبوں کے بے رحمی سے مسل دے گا

اکرم جاذب

بے یقینی کے وہ بادل زندگی پر چھا گئے
آئنے اندھے ہوئے منظر سبھی دھندلا گئے

کیا بھلا اس سے بھی بڑھ کر عشق پر آئے خزاں
زخم مثلِ گل کھلے تھے وہ بھی اب مرجھا گئے

یوں لگا اطراف کی ہر شے جگہ سے ہٹ گئی
دائروں کے اس سفر میں کس قدر چکرا گئے

کیا کریں گے سرکشی وہ لوگ جو تیرے لیے
واپسی کے سارے رستے بند کر کے آ گئے

یاد کی کھڑکی کھلی کمرے میں رونق لگ گئی
عکس بیتے موسموں کے آنکھ میں لہرا گئے

بارشوں کی آس جاذبؔ دھول بن کر اڑ گئی
آئے بادل اور پیاسی دھرتی کو ترسا گئے

غزل

جو میرے بس میں نہیں تھا وہ کام کر نہ سکا
میں گھونسلے سے گرا تو اُڑان بھر نہ سکا

درونِ ذات کئی زخم رِستے رہتے ہیں
مگر وجود پہ کوئی نشاں اُبھر نہ سکا

ذرا سا جھوٹ مری زندگی بچا لیتا
مگر میں بات سے اپنی کبھی مکر نہ سکا

نکل گیا تھا کہانی کی اگلی قسطوں سے
ہماری آنکھ کے پردے سے جو اُتر نہ سکا

میں دور سے جسے اچھا دکھائی دیتا تھا
ذرا قریب وہ آیا تو پھر ٹھہر نہ سکا

بنا کے بیٹھا ہوں تصویر تیری کاغذ پر
مگر جو رنگ بنائے تھے، اُس میں بھر نہ سکا

اسے بھی رنج بچھڑنے کا کچھ ہوا ہے ضرور
لگا کے آنکھ میں کاجل بھی وہ سنور نہ سکا

عمران اعوان

غزل

نام و نشاں نہ ہونے کا کچھ اور ہے مزا
چُھپ چُھپ کے گھر میں رونے کا کچھ اور ہے مزا

اِک عمر جس کو پانے میں مصروف ہم رہے
عجلت میں اُس کو کھونے کا کچھ اور ہے مزا

گٹھڑی کسی کے بوجھ کی سَر پر اُٹھایئے
کیونکہ یہ بوجھ ڈھونے کا کچھ اور ہے مزا

جی چاہتا ہے ساتھ رہوں تیرے عمر بھر
لیکن ترے نہ ہونے کا کچھ اور ہے مزا

ساحل پہ خیریت سے پہنچنا بھی خوب ہے
کشتی مگر ڈبونے کا کچھ اور ہے مزا

اُس خوابِ دل فریب کا انجام کچھ بھی ہو
آنکھوں میں رکھ کے سونے کا کچھ اور ہے مزا

ممکن ہے پھول بُوٹے یہاں پر ظہور ہوں
آنسو زمیں میں بونے کا کچھ اور ہے مزا

ظہور چوہان

غزل

سفر ہے راستہ ہے اور میں ہوں
پرانا مسئلہ ہے اور میں ہوں

شکار اب کون ہو گا ، دیکھنا ہے
شجر ہے فاختہ ہے اور میں ہوں

مجھے تعبیر سے باہر نکالو
مسلسل رتجگا ہے اور میں ہوں

تری تصویر بنتی جا رہی ہے
گلِ تازہ کھلا ہے اور میں ہوں

کوئی میری طرف بڑھنے لگا ہے
مقابل آئینہ ہے اور میں ہوں

دبے پاؤں مرے خوابوں میں آنا
کسی کا مشغلہ ہے اور میں ہوں

خس و خاشاک بہتے جا رہے ہیں
مرا کچا گھڑا ہے اور میں ہوں

مسافر بھی ہوں میرِ کارواں بھی
یہ میرا قافلہ ہے اور میں ہوں

عاصم اعجاز

غزل

لوگ جو روز ادھر آتے ، ادھر جاتے ہیں
اب وہ بازار سے سہمے ہوئے گھر جاتے ہیں

رزق ملتا ہے یہاں نانِ تبرک کی طرح
جن کی لاٹھی ہو وہی لے کے ثمر جاتے ہیں

بل نہیں ہیں یہ سبھی موت کے پروانے ہیں
لوگ اعداد کے زندان میں مر جاتے ہیں

ہائے بچوں سے کریں روز ہی کل کا وعدہ
اور یہی سہتے ہوئے جاں سے گذر جاتے ہیں

سب کو معلوم ہے قاتل ہیں محلوں والے
ہائے وہ لوگ کہ جو پھر بھی ادھر جاتے ہیں

ہم ہیں بازاروں میں پھرتی ہوئی زندہ لاشیں
اپنے قدموں پہ دھرے رختِ سفر جاتے ہیں

یوں ہیں فیصل پسِ دروازۂ غم سہمے ہوئے
کوئی دستک کبھی دیتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

فیصل زمان چشتی

غزل

کیا تھا اپنا ہی نقصان ہم نے
بنائی جب تری پہچان ہم نے

اسے ترکِ تعلق چاہیے تھا
کیا تھا راستہ آسان ہم نے

تعلق اس قدر سستا نہیں تھا
دیا تھا آپ کو ایمان ہم نے

جدائی اب جدائی ہی رہے گی
کبھی توڑا نہیں پیمان ہم نے

صغیرؔ اس نے نقب آخر لگائی
سمجھ رکھا تھا جو دربان ہم نے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم اور عشق کے حوالے سے
میں تری روح میں اُتر جاؤں

غزل

کیسا دکھ مجھ میں سرائت کر گیا
میری رگ رگ میں الاؤ بھر گیا

صورت آہو کبھی تھا دشت میں
دل کا اب کیا پوچھتے ہو ! مر گیا

اس نے دیکھا اور پھر دیکھا نہیں
ایسا دکھ تھا ، مجھ کو پتھر کر گیا

چھپ گیا نا شام کی آغوش میں
آج پھر سورج دیے سے ڈر گیا

میری چپ کا ان کو اندازہ نہ تھا
شہر میری گفت گو سے ڈر گیا

بیٹھے بیٹھے اک خیال آیا کوئی
اور پل میں دل خوشی سے بھر گیا

کس لئے پتوں پہ زردی چھا گئی
آج پھر کوئی پرندہ مر گیا؟

محمد نور آسی

غزل

ذرے کی کائنات سے آگے کھڑا تھا میں
باہر جو دیکھا، ذات سے آگے کھڑا تھا میں

اس کی ہر ایک بات میں تھی آگہی، مگر
ہر آگہی کی بات سے آگے کھڑا تھا میں

دکھ کی طویل رات میں سب بے زباں ہوئے
دکھ کی طویل رات سے آگے کھڑا تھا میں

مٹی میں وہ فریب تھے سب ہی بہل گئے
مٹی کے التفات سے آگے کھڑا تھا میں

اس کی نمو تھی آگ سے اور میری خاک سے
اور خاک کی بساط سے آگے کھڑا تھا میں

اُس نے مجھے پکارتے عمریں گزار دیں
اور ایک طاق رات سے آگے کھڑا تھا میں

نظریں جھکی رہیں سدا کاسے کے بوجھ سے
کاسہ گرا جو ہاتھ سے ، آگے کھڑا تھا میں

ہر آگہی کی بات سے آگے کھڑا تھا وہ
ہر دل کی واردات سے آگے کھڑا تھا میں

میں نے کہا: تو کون ہے؟ اُس نے کہا حبیب
نکلا میں اپنی ذات سے، آگے کھڑا تھا میں

بشیر احمد حبیب

غزل

جو کٹ چکے ہیں سبھی رابطے بحال کرے
اسے کہو کہ مجھے آج ایک کال کرے

جو حال ہوتا ہے ٹوٹے گھروں کا بارش میں
تمہارا ہجر مری آنکھ کا وہ حال کرے

بشکلِ اسپِ تحیر ہمیشہ رات گئے
تمہاری یاد مرا ذہن پائمال کرے

علاقہ اپنا بڑھائے مگر میں چاہتی ہوں
تری سپاہ ترے تاج کا خیال کرے

تری نگاہ کی رنگیں مزاجیاں توبہ
کبھی نڈھال کرے اور کبھی نہال کرے

اُسے نئے سے نئے ظلم ڈھانے آتے ہیں
کسے خبر کہ وہ اس بار کیا کمال کرے

اترتے رہتے ہیں پھولوں کے جیسے شعر سمن
اگر وہ شخص مرے دل کی دیکھ بھال کرے

رخسانہ سمن

غزل

عشق کی سب آیتیں جب مجھ کو ازبر ہوگئیں
دل بنا صحرا مرا، آنکھیں سمندر ہوگئیں

تیری قُربت، تیری دوری تھیں جُدا کیفیتیں
اور پھر میرے لیے دونوں برابر ہوگئیں

اب نہ سوتی ہیں نہ روتی ہیں نہ کُھلتی ہیں کبھی
ایک پتھر دل کے غم میں آنکھیں پتھر ہوگئیں

جانتی ہیں اُن کو تیرے پاس لا سکتا ہُوں مَیں
باغ کی سب تتلیاں کل شب مرے سر ہوگئیں

اک محبت کا ہوا نعمان مجھ پر یُوں اثر
باتیں بہتر، غزلیں بہتر، نظمیں بہتر ہوگئیں

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون اُٹھائے گا ترے بعد تھکن کی گٹھڑی
رُک کے چُن لیں مجھے رہگیر، یہ تقدیر کہاں

غزل

بند ہونٹوں پہ کوئی حرفِ صدا لایا ہے
اپنی خاموشی کو آواز بنا لایا ہے

بڑی مشکل سے کسی بت کو نکالا دل سے
اور دل ہے کہ کوئی اور اٹھا لایا ہے

کوئی گزرا ہے ترے شہرِ طلسمات سے اور
کتنا پاگل ہے کہ دامن کو بچا لایا ہے

مجھ کو نفرت کی طرف سارا زمانہ لایا
اور محبت کی طرف سے صرف خدا لایا ہے

کیسے ممکن ہے اسے ہجر میں شامل کرلوں
دل کوئی زخم محبت کے سوا لایا ہے

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جمالِ غم رہینِ جلالِ فن خالد
مرے سخن! ترے تن پر لباسِ سادہ رہے

غزل

وہ نظر مہرباں ہو گئی
زندگی گلستاں ہو گئی

سوئے مسجد اٹھو اب چلیں
جاگ جاؤ اذاں ہو گئی

چاند چہرہ جہاں بھی گیا
روشنی پھر وہاں ہو گئی

بعد مدت کے دیکھا اسے
دل کی دھڑکن جواں ہو گئی

کیوں وہ روٹھا ہے افضلؔ بتا
بھول تجھ سے کہاں ہو گئی

افضل ہزاروی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزلیں

خوشبو گلوں میں ہے نہ دھنک ڈالیوں میں ہے
یہ کس کی بد دعا کا اثر موسموں میں ہے

دیکھی نہیں ہے ہم نے محلات میں کہیں
وہ خوشبوئے خلوص جو کچے گھروں میں ہے

ہجرت کی سختیوں کا دکھاتا ہے آئینہ
وہ خوف دوریوں کا جو اِن قربتوں میں ہے

جن کو تری نگاہ نے صیقل نہیں کیا
سچ پوچھیے تو نقص انھی آئنوں میں ہے

سرشار عرضِ غم کا زمانہ نہیں رہا
کس سے کہوں کہ جان مری سختیوں میں ہے

اکرام الحق سرشار

میرے جذبوں کا وہ معیار نہیں ہو سکتا
عکس پانی میں گرفتار نہیں ہو سکتا

یہ تو ہم ایسے مسافر یہاں آئے تھے کبھی
ورنہ صحرا کبھی گلزار نہیں ہو سکتا

میں محبت ہوں محبت ہی عبادت ہے مری
میں کسی سے کبھی بیزار نہیں ہو سکتا

تیرے بارے میں مری اپنی بھی رائے ہے کوئی
اور اس رائے سے انکار نہیں ہو سکتا

جس کو رستے کا پتہ ہو نہ ہی منزل کی خبر
وہ کبھی قافلہ سالار نہیں ہو سکتا

وہ جو حق بات سرِ دار نہیں کہہ پایا
اور ہو گا کوئی، سرشار نہیں ہو سکتا

غزل

دیکھو ہمیں ہم اپنے ہی پسماندگان ہیں
دنیا میں رہ رہے ہیں مگر رفتگان ہیں

اپنی حقیر دنیا میں گُم، جانتے نہیں
دُنیائیں اور کتنی ہیں کتنے جہان ہیں

کتنی ہی کہکشائیں ہیں اس کہکشاں کے پار
کتنے ہی آسمان پسِ آسمان ہیں

تارے ہیں اور کتنے خلائے بسیط میں
امکان کیا ہے کتنے زمان و مکان ہیں؟

کتنے نظامِ شمسی ہیں ہر کہکشاں کے بیچ
کتنے نظام اور بھی پس از گُمان ہیں

خُود کو سمجھ نہ پایا، یہ سمجھے گا کائنات
اس ذہنِ نارسا کے بھی کیا کیا گمان ہیں

جس نے ہر ایک خواب بنایا ہے اک عذاب
اُس کی ثنا میں آج بھی رطب اُللسان ہیں

ٹھکرا کے جانے والو، ہمیں ڈھونڈنا نہیں!
ہم بے ثبات لوگ ہیں، ہم بے نشان ہیں

ہو ڈھونڈھنا ہمیں تو ستاروں میں ڈھونڈھنا!
ہم کُشتگانِ خاک فلک کے نشان ہیں

سُنتا نہیں جو دل کی تو ہم کس لئے کہیں
بے نطق و بے نوا ہیں نہ ہم بے زبان ہیں

راجہ عبدالقیوم

غزل

ایسے ماحول میں مت پوچھ کہ کیا ہوتا ہے
سر پہ جس وقت ترا دستِ عطا ہوتا ہے

مل کے ہو جاتی ہے الجھن کئی لوگوں سے مجھے
جیسے اک شعر بہت بار سنا ہوتا ہے

بانٹتے پھرتے ہیں ہر لحظہ دعاؤں کے گلاب
ہم فقیروں کو بھلا کس سے گلا ہوتا ہے

مسئلہ یہ ہے سمیٹے کوئی چھاؤں کیسے
اپنی فطرت میں تو ہر پیڑ گھنا ہوتا ہے

جس کو درکار رہائش ہو مجھے بتلائے
حجرۂ چشم ہمہ وقت کھلا ہوتا ہے

میں وہ فانوس، ہَوا جس کی ازل سے دشمن
میں وہ مقتل ہوں جو ہر وقت سجا ہوتا ہے

اس گھڑی شوق سے میں رقص کیا کرتا ہوں
جب کوئی مصرعہ ترے لب سے ادا ہوتا ہے

کوئی جتنی بھی بچاؤ کی تگ و دو کر لے
وقت کا تیر کہاں دوست خطا ہوتا ہے

کوئی ناسوت سے لاہوت تلک جا پہنچا
ایک قیدی تری دُنیا سے رہا ہوتا ہے

مستحسن جامی

غزل

تم سے احساس کے رشتے نہیں دیکھے جاتے
ہم سے تو پھول بھی سوکھے نہیں دیکھے جاتے

عمر بھر کوئی تعلق کو نبھاتا ہی نہیں
عمر بھر پیار کے سپنے نہیں دیکھے جاتے

اپنے دکھ درد کو سہہ لیں گے خوشی سے، لیکن
ہم سے دکھ درد تمھارے نہیں دیکھے جاتے

دل میں رہنا ہے تو پھر ٹھیک سے رہ لو، ورنہ
ہم سے یہ روز کے نخرے نہیں دیکھے جاتے

کل مری ماں کے چھلکتے ہوئے اشکوں نے کہا
اب ترے ہاتھ کے چھالے نہیں دیکھے جاتے

ہم تو گاؤں کے ہیں پر امن فضا کے باسی
ہم سے یہ شہر کے فتنے نہیں دیکھے جاتے

کیسے پھر ضبط ہو چہرے کی اداسی ہم سے
بال تک بھی ترے بکھرے نہیں دیکھے جاتے

محمد امین صادق

غزل

یہ خزاں بھی سوال کرتی ہے
وقفِ رنج و ملال کرتی ہے

سارے منظر اداس لگتے ہیں
گویا ہر شے ملال کرتی ہے

شاخِ جاں ہے کہ سوکھتی جائے
لاکھ وہ دیکھ بھال کرتی ہے

میں تو اس کا خیال رکھتا ہوں
وہ ہی جینا وبال کرتی ہے

زخم جب بے رُخی کے لگتے ہیں
بڑھ کے وہ اندمال کرتی ہے

سارا قصہ تو جانتی ہے وہ
کیوں مجھے پائمال کرتی ہے

پہلے کیا رنج میرے تھوڑے ہیں
وہ بھی مجھ کو نڈھال کرتی ہے

دشت میں رقص کرنے لگتا ہوں
یاد تیری دھمال کرتی ہے

میں ہی ثقلین اس کو چاہتا ہوں
وہ مجھے کب نہال کرتی ہے

ثقلین جعفری

غزل

احمد محسود

درمیاں اک حجاب تھا کوئی
آپ ، صاحب ، جناب تھا کوئی

لوگ کیا کیا بچھڑ گئے مجھ سے
جیسے سب کچھ سراب تھا کوئی

تھیں بہت پتیاں کتابوں میں
اور الگ سے گلاب تھا کوئی

اپنے آنگن ہی روشنی کی ہے
یہ بھلا آفتاب تھا کوئی

کچھ عمل دخل تھا سماج کا بھی
اتنا بھی کب خراب تھا کوئی

ہاں بتاؤ ملازمینِ شہر
سب کی آنکھوں میں خواب تھا کوئی

کب ہمیں اعتماد میں لیا ہے
کب بھلا انتخاب تھا کوئی

جاگتا تھا میں نیند میں احمد
اک عجب اضطراب تھا کوئی

غزل

زنجیر ہو کہ ہو پائل ، چھید ڈالتا ہے
یہ رقص کرتا ہے گھائل چھید ڈالتا ہے

یہ تیرے طنز کا ناخن بڑھ گیا ہے کتنا
ہلکی خراش سے بھی دل چھید ڈالتا ہے

رخسار گھِس گئے تو میں بھی سمجھ گیا ہوں
پانی کا یہ بہاؤ سِل چھید ڈالتا ہے

کس شکل کی مسافت کا سامنا ہے اُس کو
کہتا ہے آبلہ منزل چھید ڈالتا ہے

صحرا کے بعد خواہش تھی داد کی مگر قیس
کہنے لگا یہ لاحاصل چھید ڈالتا ہے

ساگر عجب ہے عادت اس کی کہ آئنہ جب
ہوتا ہے عکس کے قابل چھید ڈالتا ہے

ساگر حضور پوری

غزل

جب ترے غم کی فراوانی بہت ہوتی تھی
میرے لفظوں میں بھی تابانی بہت ہوتی تھی

شہرِ غربت سے اسی واسطے ہجرت کی ہے
خواہشوں کی وہاں قربانی بہت ہوتی تھی

ایک یہ دن ہیں کہ اک مصرع نہیں ہوتا ہے
ایک وہ دن تھے غزل خوانی بہت ہوتی تھی

گرچہ ہوتا تھا مرے چاروں طرف ایک ہجوم
پھر بھی اندر مرے ویرانی بہت ہوتی تھی

میں کھنکتی ہوئی مٹی سے بنا تھا اظہر
اس لیے میری نگہبانی بہت ہوتی تھی

اظہر کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

صدا دے رہے ہیں گماں میرے اندر
محبت نہ بھر دے دھواں میرے اندر

زمانہ مری بات سُننے لگا ہے
یہ رکھ دی ہے کس نے زباں میرے اندر

اٹھایا ذرا موجِ تنہائی نے سر
سمندر ہوا بے کراں میرے اندر

ترا ساتھ پاکر کھلے گُل یقیں کے
گلابی رہے گا سماں میرے اندر

سمائی تھی کانوں میں چھوٹی سی بالی
در آئے کئی امتحاں میرے اندر

اُسے میں نے نفرت سے ٹھکرا دیا تھا
رُکی پر نہیں داستاں میرے اندر

وہی دسترس کے مسائل ہیں باہر
وہی خواہشِ آشیاں میرے اندر

یہ طرزِ سخن ٹمٹمانے لگا ہے
مکیں تھا جو اک لامکاں میرے اندر

خدا اُس کو رکھے کہ رکھی ہے جس نے
ردا میرے سر، کہکشاں میرے اندر

ردا حاصل خلوص

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور
وہ خواب خواب ساتن جاگ سا گیا آخر
اسیرِ در بھی دریچوں تک آ گیا آخر

غزل

چونکہ ہے خوگرِ آلام ، نہیں ٹوٹے گا
دل مرا ہو کے بھی ناکام نہیں ٹوٹے گا

ٹوٹ جائے گا مرا خوابِ ملاقات، مگر
نشہِ بادۂ گل فام نہیں ٹوٹے گا

کلمہِ حق سرِ دربار نہیں کہہ سکتا
جب تلک کاسہِ انعام نہیں ٹوٹے گا

ٹوٹ جائیں گے پر و بال قفس میں،لیکن
عزمِ پرواز تہہِ دام نہیں ٹوٹے گا

ٹوٹ جائے گا ترا شیشہِ پیماں ، لیکن
ہاتھ سے گر کے مرا جام نہیں ٹوٹے گا

تاج خوش فہمی ہماری یہی کہتی ہے ابھی
حلقہِ گردشِ ایام نہیں ٹوٹے گا

تاج الدین تاج

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے ہونٹوں پہ ہے سب کے دل کی
ڈھونڈیے اپنے ہی اندر مجھ کو

غزل

جیا قریشی

سپاہِ وقت کی واللہ آبرو ہے چراغ
ہوا کے سامنے اب تک بھی سرخرو ہے چراغ

تجھے پتہ بھی ہے دنیا، تجھے خبر بھی ہے؟
کہ میری آنکھ ستارہ، مرا لہو ہے چراغ

ہوائے تند! بس اتنا تجھے بتانا ہے
مرا عزیز پتنگا، مرا عدو ہے چراغ

ہمیں پتہ ہے کہ کس دُھن میں محوِ رقصاں ہے
ہمیں پتہ ہے کہ کیوں محوِ جستجو ہے چراغ

چھڑک رہا ہے منڈیروں پہ عطر کی کی مہکار
کسی گلاب کی مانند مشکبو ہے چراغ

کئی دنوں سے جیا رات دن، گرفتہ ہے
کئی دنوں سے اندھیروں کے روبرو ہے چراغ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خود اُلجھتا ہوں، خود سلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں، کچھ سنور جاؤں

غزل

کھولیں گے نہیں قفل نہ پہچان کریں گے
ہم دور سے اندازۂ زندان کریں گے

سیٹی سے بلالیں گے پرندوں کو زمیں پر
مینار ترے شہر کے ویران کریں گے

صحرا میں اتاریں گے سفینے مرے ملاح
دریا ترے پانی کو پریشان کریں گے

اک بار فقط اذنِ ملاقات عطا ہو
پھر وصل کی خواہش نہ مری جان کریں گے

بچے ہیں یہ بروقت اگر باز نہ آئے
اک روز محبت کا بھی نقصان کریں گے

اس طرزِ ہنرمندی سے ہم اسکو چھوئیں گے
پتھر بھی اگر ہے اُسے مرجان کریں گے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

غزل

جو جھتے سانپ کو پتا ہی نہیں
گھونسلے میں تو فاختہ ہی نہیں

مور کی طرح ناچتا ہوں میں
کوئی جنگل میں دیکھتا ہی نہیں

شام کا زرد شوم چمگادڑ
دن کے ٹیرس پہ بیٹھتا ہی نہیں

ایک ہی گھاٹ پر کھڑے ہیں اور
شیر بکری کو گھورتا ہی نہیں

بیٹھ رہتا ہے دن کے عارضؔ پر
شام کا سانپ رینگتا ہی نہیں

سرفراز عارض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز انوکھے زاویے سے یاد کر، خالد! اُسے
زیبِ لب رکھ اِک دُعائے نو جمال اُس کے لیے

غزل

کون اچھا ہے یہاں، کون، برا یاد نہیں
اب مجھے کچھ بھی تو اک تیرے سوا یاد نہیں

جانے والے! تو مجھے یاد سدا رکھے گا
اب تجھے کوئی بھی جو، میری وفا یاد نہیں

فیصلہ دل کا تھا، اب میں نہ وہاں جاؤں گی
پہنچ کیسے، تری گلیوں میں گئی، یاد نہیں

میں نے کس رخ سے پکارا تھا تجھے جان مری!
جانے کس سمت گئی، میری صدا یاد نہیں

یاد آنے لگیں ...... کوکی وہ پرانی باتیں
برسوں ہی بھولی رہی، جن کو کیا یاد نہیں

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ارادتوں کے تقاضے تہِ ارادہ رہے
سمٹ سمٹ کے بھی بازو مرے کشادہ رہے

غزلیں

طرزِ عمل میں رنگ نہ اترے ناممکن ہے
پیار رہِ اظہار نہ ڈھونڈے ناممکن ہے

لاکھ حصاروں میں بھی ذات مقید رکھیں
قفلِ دروں کو عشق نہ کھولے ناممکن ہے

اس ترسیل میں کھوٹ رکاوٹ بن جاتی ہے
دل سے دل کو راہ نہ نکلے ناممکن ہے

برسوں کی اک لاحاصل تاریک مسافت
روشن شمعِ فکر نہ کر دے ناممکن ہے

دل کے اندر پھول محبت کا کھلنے سے
خوشبو چاروں سمت نہ بکھرے ناممکن ہے

عنبرین خان

اداس چہرے اداس منظر یونہی ہمیشہ نہیں رہیں گے
ہواؤں کا جب بدل گیا رخ تو صحرا صحرا نہیں رہیں گے

منافرت کا سبق پڑھا کے دکانِ کینہ چلانے والو!
جفا دروں کے کہے پہ طوفاں سدا تو برپا نہیں رہیں گے

حیات کے سب سیاہ گوشوں میں روشنی آ گہی کی ہو گی
کریہہ منظر زیادہ مدت زمیں کا حصہ نہیں رہیں گے

خیال رکھنا یہ بپھری موجوں کا جو تلاطم ہے ختم ہو گا
جو نالے دریا بنے ہوئے ہیں، ہمیشہ دریا نہیں رہیں گے

بہار آئی تو کونپلوں سے گلاب و برگ و ثمر بنیں گے
یہ بکھرے پتے اداس موسم مرا حوالہ نہیں رہیں گے

سفر کی دشواریوں کو اپنے اٹل ارادے بتا رہے ہیں
شکستہ پائی اگر رہے گی تو پا شکستہ نہیں رہیں گے

غزلیں

بے بسی وہ تھی کہ اندازہ نہیں ہوتا تھا
پھول ہو کر بھی میں جب تازہ نہیں ہوتا تھا

چپ تو اس وقت بھی دروازہ نہیں ہوتا تھا
جب ہواؤں کا بھی آوازہ نہیں ہوتا تھا

کارِ ناسور سے ملتا تھا ہمیں لطفِ دگر
خود بخود زخم کبھی تازہ نہیں ہوتا تھا

دل کہ کر دیتا تھا ہنس کر نظر انداز اُسے
اِسے نقصان کا خمیازہ نہیں ہوتا تھا

اس کے قدموں کی اٹھی گرد سے کھل جاتے تھے
اور اس وقت کوئی غازہ نہیں ہوتا تھا

علی آرش

میں چراغِ شبِ آخریں تو نہیں، مجھ کو روشن کرو
اے شگونہ بدن! اے مرے مہ جبیں! مجھ کو روشن کرو

مجھ کو روشن کرو، اب اندھیرا ہے مدِ مقابل مرے
ہار جاؤں نہ میں جنگ اس سے کہیں، مجھ کو روشن کرو

میں کہ متروک گھر کا کوئی طاق ہوں، خاک ہی خاک ہوں
میرے ہونے کا مجھ کو دلاؤ یقیں، مجھ کو روشن کرو

ملنے والوں کی فہرست کوئی نہیں، میں ہوں گوشہ نشیں
پھر بھی کہتی ہے مجھ سے مری آستیں "مجھ کو روشن کرو"

اِس جگہ سے ہوا کا گزر ہی نہیں، کوئی ڈر ہی نہیں
جو نہی موقع ملے آ کے زیرِ زمیں، مجھ کو روشن کرو

گھر کے جیسا ہی تاریک و پامال ہوں، کتنا بدحال ہوں
لوٹ آؤ یہاں، اے پرانے مکیں! مجھ کو روشن کرو

مجھ کو روشن کرو تا کہ روشن کروں ساری دنیا کو میں
اے مرے ہمنشیں، روشنی کے امیں! مجھ کو روشن کرو

غزل

قرآن تو کہتا ہے ایمان محبت ہے
انسان سمجھ بیٹھا شیطان محبت ہے

تعریف محبت کی معلوم نہیں مجھ کو
لگتا ہے مجھے تیری مسکان محبت ہے

جذبات سے عاری ہوں ممنوعِ تعلق ہوں
بے فیض سے لوگوں میں انجان محبت ہے

آسان محبت ہے قصہ ہو، کہانی ہو
جنگل ہے گھنا غم کا زندان محبت ہے

مطلب ہی نہیں کوئی اس حرص کی دنیا سے
ایثار محبت ہے، احسان محبت ہے

ترتیب سے ڈھالا ہے الفاظ کو غزلوں میں
اب زین کا دل سارا، اے جان! محبت ہے

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون تمھیں سمجھائے خالد
کون اُٹھائے بوجھ تمھارا

غزلیں

اب تو یوں ہے، کوئی دلدار نہیں ہے میرا
اس بھرے شہر میں غم خوار نہیں ہے میرا

اس کی نظروں میں جو وقعت ہے مری، جانتی ہوں
مطلبی شخص طلبگار نہیں ہے میرا

اجنبی شخص تجھے آنے میں تاخیر ہوئی
اب تو یہ دل بھی طرفدار نہیں ہے میرا

چوم کر پھول نیا رنگ کہاں آئے گا
دیکھیے، گل ہے یہ رخسار نہیں ہے میرا

کس توقع پہ میں دریا میں اُتر جاؤں عروج
منتظر کوئی بھی اس پار نہیں ہے میرا

عروج درانی

کیا بتائیں یار ہم کو سادگی نے مار ڈالا
موت سے ہم ڈر رہے تھے، زندگی نے مار ڈالا

زندگی بھر منتظر تھے ایک دن وہ آئیں گے
پھر ہوا یوں ان کے آنے کی خوشی نے مار ڈالا

اک توجہ چاہیے تھی اور کیا ہم مانگتے
دیکھ لیجے مر گئے ہم، بے حسی نے مار ڈالا

اور بھی چہرے بہت تھے خوبصورت اُس گلی
ہم کو ان کی گفتگو کی سادگی نے مار ڈالا

غزل

آپ پر ہم کو ہے بھروسہ پر
ہاں مگر اعتبار تھوڑی ہے

ہم تو بیٹھے ہیں عادتاً یونہی
آپ کا انتظار تھوڑی ہے

بات کرنے سے کیوں جھجکتے ہو
اس کا لہجہ ہے دھار تھوڑی ہے

کچھ تو آئے ہیں رسمِ دنیا کو
ہر کوئی سوگوار تھوڑی ہے

کر رہا ہے وہ معذرت تو، مگر
جرم پر شرمسار تھوڑی ہے

آڑھے ترچھے سے لفظ لکھتا ہوں
شاعروں میں شمار تھوڑی ہے

خود سے اکتا گیا ہوں بس شاہد
زندگی سے فرار تھوڑی ہے

رانا محمد شاہد

غزل

تیری راہوں سے لَف کھڑے ہیں درخت
صبح سے گُل بہ کَف کھڑے ہیں درخت

سیر کو کون گُل بدن آیا
باغ میں صف بہ صف کھڑے ہیں درخت

میرا سایہ بہت پریشاں ہے
میرے چاروں طرف کھڑے ہیں درخت

کیا خبر خُوش نوا پرندوں کو
بن کے کس کا ہدف کھڑے ہیں درخت

میرے گھر آئیں سارے تپ زدگاں
میرے رستے سے لَف کھڑے ہیں درخت

ان کی چھاؤں میں ہم بھی بیٹھیں کہ جو
سُوئے شہرِ نجف کھڑے ہیں درخت

جنید نسیم سیٹھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جب بھی نظر اُٹھی تو فلک کی طرف اُٹھی
برگشتہ آسمان سے گویا نہ تُو ، نہ مَیں

غزل

سودائے ہست و بود کو سستا سمجھ لیا
انگلی کٹی تو عشقِ زلیخا سمجھ لیا

ہم لوگ سادہ لوح تھے باتوں میں آ گئے
وعدہ امیرِ شہر کا پکا سمجھ لیا

ایسا وہ بد گمان تھا تتلی سے ڈر گیا
بھیجا جو اس کو پھول تو کانٹا سمجھ لیا

بھٹکا گئیں سدا مجھے کم فہمیاں مری
جنگل تھا سامنے، اسے رستہ سمجھ لیا

جس نے بھی ان کو آئنہ دکھلا دیا کبھی
لوگوں نے اس وجود کو خطرہ سمجھ لیا

کیسے گنوا دیا تھا وہ موقع بتاؤں کیا
وہ آخری تھا میں نے جو پہلا سمجھ لیا

شمسہ نورین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رکھتا ہے یہاں کون خبر عیب و ہنر کی
خالد ہمیں کس نے نظر انداز کیا ہے

غزل

یہ دل نہ جانے کب سے طلب گار ہے ترا
مجھ کو تری طلب ہے تو یہ پیار ہے ترا

میں ہوں کہ بس دعا میں ہی مانگا کروں تجھے
سارا جہان یوں تو خریدار ہے ترا

تیرے سوا کسی کو دکھاتا نہیں مجھے
آنکھوں کا آئینہ بھی طرف دار ہے ترا

تو نے کبھی کہا ہی نہیں میں سمجھ گئی
یہ سب سے منفرد ہی تو اظہار ہے ترا

پھولوں کو دیکھ لوں تو تری دید ہو مجھے
میرے لیے تو بس یہی دیدار ہے ترا

ہر پل وہ سوچتا ہے ترے بارے میں رشا
تو خوش نصیب ہے کہ وہ دلدار ہے ترا

آمنہ روشنی رشا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زمیں کو پھول ، فضا کو گھٹائیں دیتا ہے
مجھے فلک سے وہ اب تک صدائیں دیتا ہے

غزل

دلِ ملول میں لاچاریوں کا موسم ہے
یہ اپنے آپ سے بیزاریوں کا موسم ہے

بس ایک شخص کے ناز و ادا کی خاطر ہی
ہماری آنکھ میں دلداریوں کا موسم ہے

امیرِ شہر کی جیبوں میں مال بھرنے تک
ہوائے شہر میں بیماریوں کا موسم ہے

کسی بھی شرط پہ ایماں خریدنے والے
بتا رہے ہیں کہ غداریوں کا موسم ہے

چراغ لے کے بھی ڈھونڈو وفا نہیں ملتی
ہر ایک سمت ہی ناداریوں کا موسم ہے

اگر سماج میں انصاف بک رہا ہے ابھی
قسم خدا کی یہ درباریوں کا موسم ہے

اسی سے جان لو منزل قریب ہے اپنی
کہ اپنی راہ میں جو دشواریوں کا موسم ہے

فضائے سوگ ہے طلحہ ہزار آنسو ہیں
میں جانتا ہوں کہ غمخواریوں کا موسم ہے

طلحہ غفور

غزل

مجھ سے مت پوچھ دل لگی کیا ہے
عشق والوں کی زندگی کیا ہے

آرزو ہے نہ کوئی خواہش ہے
حسن والوں کی بے رُخی کیا ہے

دل جلا کر تو روشنی کی تھی
روشنی میں یہ تیرگی کیا ہے

خود کو ہارا تو کیا رہا باقی
کون جانے یہ بندگی کیا ہے

تو نے بخشا ہے اک نیا اسلوب
ویسے قصے میں عمدگی کیا ہے

تیرے ہنسنے سے جاگتی ہے بہار
اور پھولوں میں تازگی کیا ہے!

شمسیلہ سعید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو ، نہ مَیں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو ، نہ مَیں

جام کی سوزوکی

جام صاحب اپنی ماضی بعید کے قصے اکثر سنایا کرتے ہیں جو ان کے نزدیک کل کی بات ہے۔ ان سے ایک مشہور الزماں قصہ ان کی سوزوکی کے بارے میں ہے جو ان کو ان کے والد محترم کی جانب سے میٹرک میں اعلیٰ نمبروں یعنی سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے کے بعد تحفہ کے طور پر دیا گیا تاکہ وہ کالج میں شان کے ساتھ داخلہ لے سکیں بشرطیکہ ان کو کسی کالج نے داخلہ دے دیا تو، قصہ مختصر یہ کہ ایک دن آپ گھر تشریف لائے تو سامنے ایک پرانی مشین جس کے دو پہیے تھے نظر آئی، غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ صدیوں پرانی مشین ایک سوزوکی کی موٹر سائیکل ہے جو سوزوکی فٹفٹی کہلاتی ہے۔

بغور معائنہ کرنے کے بعد جام صاحب کو اندازہ ہوا، یہ ان کا تحفہ ہے جو والد گرامی ان کے قیاس میں کسی کباڑی کی دکان سے لوہے کے دام خرید لائے تھے۔ والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے سوزوکی کی خوبیوں کی ایک لمبی لسٹ نکال لی اور ان کو سنانا شروع کی۔ جام صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے ٹوکنے کی بارہا کوشش کی مگر سب بے سود، ان کو چابی دیتے ہوئے والد صاحب کہنے لگے جاؤ عیش کرو، جام صاحب قیاس کرتے ہیں کہ سوزوکی کی قیمت ان کے اس بائیسکل سے کم محسوس ہوئی جو اب غائب تھی بقول والد محترم انھوں نے بائیسکل فروخت کردی تھی کیونکہ سوزوکی کے ہوتے ہوئے ان کو اب اس کی کیا ضرورت تھی۔

انھوں نے طوعاً کرہاً ان کی دلیل پر سر تسلیم خم کیا اور سوزوکی کو اپنا مان لیا ایک مرتبہ تو خیال آیا کہ جیسے نمبر ویسا انعام۔ جام صاحب نے فوراً سوزوکی کی سواری کرنے کا پروگرام بنایا۔ سٹارٹ کرنے کی کافی کوشش کی مگر نتیجہ صفر، کیکیں مار مار کر جام صاحب کی زبان منہ سے باہر نکل آئی پر سوزوکی سٹارٹ ہونے سے صاف مکر گئی۔

جام صاحب سوزوکی کو لے کر موٹر میکینک کے پاس تشریف لے گئے۔ جام صاحب کو دیکھتے ہی شبیر میکینک نے ان کو خوش آمدید کہا اور چہرے پر لکھا تھا، بیٹا اب تو چکر لگتے رہیں گے فکر کی کوئی بات نہیں، ہم کو مستقل مریض سوزوکی کی صورت میں مل گیا۔

بہرحال شبیر نے سوزوکی سٹارٹ کردی۔ اب ذرا جام صاحب نے سوزوکی آگے بڑھائی تو سوزوکی جھٹکے سے بند ہوگئی۔ اس بار انجن چل رہا تھا پر سوزوکی آگے

محمد کلیم

بڑھنے سے انکاری تھی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ سوزوکی کی چین اتر کر پچھلی کراری میں اڑ چکی تھی، جام صاحب نے بڑی محنت اور ہمت کے ساتھ چین چڑھائی۔ چین تو چڑھ گئی پر ہاتھ سارے کالے ہو گئے تھے۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا ایک دن ایک ساتھی طالب علم نے آپ سے استفسار کیا کہ آپ فوٹو سٹیٹ کی دکان پر کام کرتے ہیں، انھوں نے جب انکار کیا تو وہ بولے پھر آپ کے ہاتھ کالے کیوں رہتے ہیں؟

اس کا جواب جام صاحب کے پاس نہ تھا۔

ایک دن جام صاحب اپنے دوست کو لے کر سیر پر نکلنے لگے سوزوکی سٹارٹ کی گیئر لگایا جب کلچ چھوڑا تو سوزوکی پچھلے ویل پر کھڑی ہو چکی تھی اور ایک ویل پر چلی جا رہی تھی۔ جام اور دوست صاحب نیچے سڑک پر تھے اور سوزوکی سامنے درخت میں جا لگی، لوگ یہ تماشا سوزوکی اور جام صاحب کی حالت زار پر قہقہے لگا رہے تھے، جام صاحب سوزوکی کے کلچ کو یاد کر رہے تھے جو کل ہی انہوں نے شبیر مستری سے ٹھیک کرایا تھا۔

ایک دن ان کی ففٹی دوست کے گھر کھڑی تھی تو دوست کی والدہ تشریف لائیں، بڑے غصہ میں انھوں نے حکم صادر فرمایا یہ اپنا کباڑ سڑک پر کھڑا کیا کرو جب بھی تم آتے ہو تمھاری موٹر سائیکل تختے میں موبل آئل کے دھبے دے جاتی ہے۔ یہ داغ لاکھ دھونے سے بھی نہیں جاتے۔ ہمارے نئے فرش کا اس نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔ انھوں نے سوزوکی نکالی اور گھر کی راہ لی اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ انہوں نے کتنی مرتبہ شبیر مستری سے انجن آئل کی لیکج ختم کروائی تھی مگر سوزوکی میں اتنے سوراخ تھے کہ ہر دن نئے سوراخ سے آئل لیک ہو جاتا تھا۔ ایک طرف انجن آئل جلدی ختم ہو جاتا تھا اور عزت مفت میں ہو جاتی تھی۔

ایک دن جام صاحب نے اپنے ہمسائے سے شرط لگائی کہ ان کی ففٹی، اس کے 125 سے ریس جیت سکتی ہے۔ ریس کا ٹائم مقرر ہوا، ریس شروع ہوئی اور جام صاحب ریس جیت گئے لیکن سوزوکی کا انجن سیز کرا بیٹھے، اب جب اس کی مرمت کے لیے شبیر مستری کے پاس تشریف لائے تو اس نے جو بل بنا دیا وہ موٹر سائیکل کی قیمت سے تین گنا زیادہ تھا۔ والد صاحب کے گوش گزار کیا تو انہوں نے فرمایا بیٹا تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ سوزوکی کے مزے لے سکو کل سے کالج بس پر جانا، وہ دن اور آج کا دن سوزوکی ایک درخت کے نیچے کھڑی چپ کھا رہی ہے۔ کباڑی نے بھی اس کو لینے سے انکار کر دیا ہے کہ اس کا لوہا گل چکا ہے ہمارے کس کام کا یہ ناقص لوہا۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

ڈپٹی کمشنر کے شب و روز..... گوجرانوالہ، حافظ آباد: گوجرانوالہ آ کر سب عُقدے ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔ پرویز مسعود نے سہ طرفہ حملہ کیا تھا۔ وائیں صاحب کو بہکایا کہ میں ان کی حکم عدولی کر کے پنڈی چلا گیا ہوں کیونکہ میں اُن کے فیصلے سے ناخوش ہوں اور کمشنر لگنا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی تک اِس بات کو بھول نہیں پایا تھا کہ میاں صاحب نے کسی زمانے میں میری کمشنری کے احکامات جاری کیے تھے۔ اب تو میں گریڈ ۱۹ میں پروموٹ بھی ہو گیا تھا۔ یہ ان دنوں الیکشنگ چیف سیکرٹری تھا۔ انور زاہد حج پر جاتے جاتے چارج اسے دے گیا تھا۔ ساتھ ہی کمشنر گوجرانوالہ کو ڈرایا کہ وہ کمشنری کی پیٹی

مضبوطی سے باندھ لے کیونکہ گرہیں کھولنے والا آن پہنچا ہے - بطور حفظ ماتقدم وزیراعظم سیکرٹریٹ میں تعینات نذیر سعید کی ڈیوٹی لگائی کہ ڈی سی کو وزیراعظم سے ملنے نہ دیا جائے۔ میری نگرانی کا بھی سکہ بند انتظام کیا۔ وسیم سجاد کے کمرے میں مجھے تلاش کرنا کار دارد تھا۔

اظہر حسن ندیم وہاں ڈی آئی جی تھے۔ نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس قدر نرم خو شخص پولیس سروس میں آ کیسے گیا ہے۔ ان سے پرانی یاداللہ تھی۔ ان کے والد صاحب تلہ گنگ میں تحصیلدار رہے تھے۔ اس وقت تیسری جماعت میں تھے۔ کچھ عرصہ پی سی ایس بھی رہے۔ فیصل آباد میں ٹریننگ لی۔ ان سے ہر روز ملاقات ہوتی۔ قانونی موشگافیاں تو کیا بتانی تھیں کیونکہ ان دنوں میں خود نو وارد تھا، البتہ ضابطے کی کارروائی سے آگاہ کرتا رہا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو پہلی بات ہی یہ بتائی کہ کمشنر تم سے ہراساں ہے۔ چیف سیکرٹری کے گروپ سے ہے جو اس کی سوچ ہوگی وہی اس کی ہوگی۔ عجیب قسم کی سوچ رکھتا ہے اگر کوئی تحصیلداری سے صوبائی سروس میں آیا ہو اس افسر کو تو گلے لگا لیتا ہے لیکن ڈائریکٹ افسروں سے خاصا الرجک ہے۔ بہتر ہوگا کہ پہلی ملاقات میں اس کے وسوسے ختم کرو۔ ویسے آدمی بھلا مانس ہے۔ یہ آخری فقرہ بطور حفظ ماتقدم استعمال کیا جاتا ہے۔ کرشن چندر نے ان معاشرتی رویوں کا بڑے خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔ ایک دوست کے متعلق لکھا۔ گو آدمی بڑا کمینہ ہے مگر دل کا بڑا صاف ہے۔ دنیا کی کوئی ڈکشنری بھی ان دو صفات کو یکجا نہیں کر سکتی۔

کامران صاحب سے ملاقات ہوئی تو اظہر حسن ندیم کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ کہنے لگے ''جنوبی پنجاب اور سنٹرل پنجاب میں بڑا فرق ہے۔ یہاں سیاست کے علاوہ نوکری بھی کرنا پڑتی ہے۔ اب شفقت محمود کو ہی دیکھ لیں۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ تعلق تھا نوکری چھوڑ دی۔ دو عملی زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی۔ آپ سے پہلے خوشنود لاشاری تھا۔ نہایت فرض شناس اور ایمان دار افسر تھا۔ ضلع کچہری کا ناک نقشہ بدل دیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے حکومت سے ایک ٹکہ بھی نہیں لیا، سب اپنی مدد آپ کے تحت ڈی سی ویلفیئر فنڈ سے رقم استعمال کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی اس کے نقش قدم پر چل کر ضلع کی فلاح کے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔

کامران رسول کے ساتھ میں نے کبھی کام تو نہ کیا تھا لیکن میں اسے اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اس کے ننھیال تلہ گنگ کے تھے۔ نانا جی مولوی حمید (حمید) محلہ سادات کے بالکل قریب رہتے تھے۔ والد صاحب فتح جنگ کے رہنے والے تھے اور کسی پرائمری سکول کے مدرس تھے۔ میں اُسے صرف ایک مرتبہ ملا۔ وہ بھی اتفاقاً۔ یہ اور شہزاد حسن پرویز ملک سلیم اقبال کو کوئی چیز دینے اس کے گھر آئے تھے۔ ملک صاحب ان دنوں وزیر تکملہ امداد باہمی تھے۔ تعارف کراتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ کمال ہے ایک تلہ گنگوی دوسرے تلہ گنگوی کو نہیں پہچانتا۔ ویسے اس دن میں انہیں نہ ہی پہچانتا تو بہتر تھا کیونکہ ہر دو اصحاب کی حالت دیدنی تھی۔

اس قدر جامع لیکچر اور پند و نصائح کی جو پوٹلی انہوں نے کھولی تھی اس کا جواب دینا لازمی ہو گیا۔ میرا خیال تھا رسمی ملاقات ہے سلام کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ اظہر حسن ندیم کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ عرض کیا ''آپ نے درست فرمایا ہے۔ جنوبی پنجاب اور سنٹرل پنجاب میں بڑا فرق ہے۔ میں اتفاق سے بلوچستان میں بھی رہا ہوں۔ وہاں کے لوگ ابھی تک اس منافقت کا شکار نہیں ہوئے جو یہاں کا سکہ رائج الوقت ہے۔ آپ نے شفقت محمود کی بات کی ہے۔ ساری سروس میں وہ پیپلز پارٹی کا وفادار رہا ہے، وہ پیپلیا افسر مشہور تھا اگر ضمیر کی خلش محسوس کرتا تو اُس وقت نوکری چھوڑ دیتا۔ اب جب میاں نواز شریف نے اسے کھڈے لائن لگایا ہے تو چند بوند خون دے کر شہیدوں میں شامل ہو گیا ہے۔ ویسے ذہین انسان ہے اسمبلی کی ممبری کو اس نے دُور سے دیکھ لیا ہے۔ کامران رسول نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''جس خوشنود اختر لاشاری کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ یقیناً مستعد افسر ہو گا کیونکہ ایک ولیر افسر ہی قریباً سوا کروڑ روپے کا زر کثیر اللوں تللوں میں خرچ کر سکتا ہے۔ صرف ڈی سی کے ایک کمرے میں پینلنگ پر 12 سے 14 لاکھ خرچ ہوئے ہیں۔ ہر تالا چھ ہزار میں پڑا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جاتے جاتے چھ لاکھ ریڈ کراس کی مد سے نکال کر خرچ کر گیا ہے جو ایک بہت بڑا جرم ہے اور اس کی سزا دفعہ 409 ت پ میں درج ہے۔ سادہ لفظوں میں ایک سرکاری اہلکار خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہوا ہے۔''

کامران صاحب کا بس چلتا تو مجھے اپنے چپڑاسی سے باہر پھینکوا دیتے۔ ''اور ہاں آخری بات۔ میں نے نہ تو کبھی اپنے سے سینئر افسروں کے خلاف سازش کی ہے اور نہ ارادہ ہے۔ بس آپ سے ایک ہی گزارش ہے کہ مجھے کبھی آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ جب عزت نفس کا سوال آ جائے تو پھر میرے تئیں باقی سب باتیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔''

کامران صاحب نے ساؤتھ چائنا سی کی طرح کئی رنگ بدلے۔ معاملہ فہم تھے، حقیقت بھانپ گئے۔ لجاجت آمیز لہجے میں بولے ''شاہ صاحب! اگر آپ نے لاشاری کی شکایت کی تو لوگ کہیں گے You are trying to pull the rug from under his feet آخر آپ کا پیش رو ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے نیک نیتی سے یا کسی غلط فہمی کی بنا پر رقم نکلوا لی ہو۔ آپ ڈی سی فنڈ سے جمع کرا دیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب جرم ایک دفعہ سرزد ہو جائے تو پھر اس قسم کی کارروائی سے Mitigating circumstances تو ہو سکتے ہیں جرم ختم نہیں ہوتا۔ اگر میں پرچہ درج نہ بھی کراؤں تو بھی ایک قانون دان ہونے کے ناطے آپ یہ تو جانتے ہیں کہ فوجداری مقدمات میں Time does not run against the prosecution پرچہ آج سے دس

سال بعد بھی درج ہو سکتا ہے۔" اس حقیقت پسندانہ گفتگو کا ایک فائدہ ہوا۔ کامران صاحب سمجھ گئے کہ یہاں پانی مرتا ہے۔ انھوں نے رخصتی کے وقت ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

ہماری رسمی ملاقات سے پہلے ہی انھوں نے گریڈ کشتن روز اوّل کے مصداق مجھے ایک ڈی او لکھا جس میں ضلعی افسروں کی نااہلی پر اظہار ناراضی کیا گیا تھا اور ساتھ ہی مجھے بھی ہدایت کی گئی تھی کہ میں سیلاب زدہ علاقوں کے طوفانی دورے کروں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ماتحت عملہ لوگوں سے ساز باز کر کے کرپشن کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی ایک کاپی برائے اطلاع چیف سیکرٹری کو بھجوائی گئی تھی۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ ان کے ایجنڈے پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا ہے۔ میں نے خط پڑھتے ہی ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ماتحت افسران کی عمومی جواب طلبی کر لی اور اس ضمن میں کمشنر کے خط کی فوٹو کاپی لف کر دی۔ کمشنر کو بھی میں نے لکھا The officers have been directed to gird up there loins and work with greater devotion. dedication and unabated vigor. میں نے اپنے طوفانی دورے کا شیڈول بھیجا اور ساتھ ہی ان سے درخواست کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں۔ لوگ مقبول عوامی افسر کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور ماتحت عملے میں بھی احساس ذمہ داری بڑھے گا۔ ہر روز صبح دورے کا آغاز چھ بجے سے ہونا تھا۔ مجھے علم تھا کہ کمشنر 11 بجے دن سے پہلے بستر چھوڑنے کی غلطی نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا سال آرام سے کٹ گیا اور انہوں نے کسی قسم کا سلسلہ جنبانی نہ کیا۔

میرے چارج لینے کے کچھ روز بعد وائس صاحب تشریف لے آئے۔ کامونکی کا ایم پی اے وکیل خان کرامویں ہسپتال میں دل کے آپریشن سے جانبر نہ ہو سکا تھا۔ وکیل خان سے میری ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ اس وقت وہ لندن میں تھا۔ اس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ افسر اُس کا نام لیتے ہوئے کانپتے تھے۔ گو کم پڑھا لکھا تھا لیکن ہر قانونی ضابطہ جانتا ہی نہ تھا بلکہ اُس کو حسب ضرورت استعمال کرنے کے گر سے بھی واقف تھا۔ اگر کسی پولیس افسر سے ناراض ہوتا تو اس کے خلاف بھی پرچہ درج کرانے سے نہ چوکتا۔ افسروں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے اپنے ساتھ بندوق برداروں کا پورا جتھہ رکھتا۔ جب وہ دروازہ کھول کر ڈی سی، ایس پی کے دفتر میں داخل ہوتا تو گارڈ بھی دھپ دھپ کرتے بلا اجازت اندر آ جاتے۔ اس کے ہاتھ میں مطالبات کی فہرست ہوتی اور منہ میں زبان کے علاوہ گالیاں اور دھمکیاں مچل رہی ہوتیں۔ ہر کسی میں حسب ظرف بادہ باقتا۔ کمال کا ماہر نفسیات تھا۔ اسے پتہ تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے، کس قماش اور مزاج کا ہے، کتنا پریشر

برداشت کرسکتا ہے۔ جب ہجرت کر کے آیا تو ایک ٹکڑا زمین ملا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹکڑا زمین پھیل کر مربع بن گیا۔ مربع پھیل کر ہر گاؤں میں پھیل گیا۔ اہل دیہہ اس کے نام کی مالا جپنے لگے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک ہی مدمقابل تھا اور اتفاق سے وہ بھی راجپوت تھا۔ رانا نذیر! اس نے ضلع کونسل کی ممبری سے جو جست لگائی تو وفاقی وزارت پر جا کر رُکا۔ احتیاطاً ضلع کونسل کی چیئرمینی بھی اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ دی جس کی سادگی، حماقت کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔ جب وہ بولتا تو سمجھ نہ آتی کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یوں لگتا جیسے کوئی بہلول یا بغلول غوں غاں کر رہا ہے۔ چیک پر دستخط کرنے کے لئے اسے انگلی رکھ کر بتانا پڑتا کہ یہاں پر گھونگھی پھیر دو۔ وہ بھی بغیر دیکھ بھال کے دستخط کر دیتا کیونکہ اس سے پہلے ان کی پڑتال رانا صاحب کر چکے ہوتے۔ اس بات کا کریڈٹ رانا صاحب کو ضرور جاتا تھا کہ انھوں نے کمال محنت اور جانفشانی سے اسے دستخط کرنا سکھا دیئے تھے، نہیں تو انگوٹھا لگانے کی صورت میں مخالفین کو مذاق اُڑانے کا موقع ملتا۔

وائیں صاحب نے رانا صاحب کے گھر جا کر فاتحہ خوانی کی۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اس لئے تھوڑی سی تقریر بھی کرنا پڑی۔ انھوں نے رانا صاحب کی ناگہانی موت کو ملک و قوم کے لئے نقصانِ عظیم قرار دیا۔ ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں روز روز کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ علاقہ اپنے محسن اور پارٹی اپنے رہنما سے محروم ہو گئی تھی۔ آخر میں جب انہوں نے اعلان کیا کہ حق بہ حقدار رسید کے مصداق پارٹی ٹکٹ (مرحوم) کے فرزند رانا شمشاد کو دیا جائے گا تو لوگوں نے بے خبری میں اس سوگ کے عالم میں بھی تالیاں بجا دیں۔

ملک سلیم اقبال، چوہدری اقبال اور میں ایک کونے میں بیٹھے وائیں صاحب کے ارشادات سن رہے تھے۔ ''بہت بڑا اداکار ہے'' چوہدری اقبال نے سرگوشی کی۔ مہان ایکٹر! ملک سلیم نے گرہ لگائی۔ جو کچھ دونوں وزیروں نے کہا میں اس کا عینی گواہ اور تائید کنندہ تھا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ وائیں صاحب کو فون پر وکیل خان کی موت کی خبر سنائی تو اُن کا پہلا ردِعمل تھا۔ خس کم جہاں پاک۔

فاتحہ کے بعد ہم واپس سرکٹ ہاؤس آئے تو راستے میں دونوں وزیروں نے ایک بری خبر سنائی۔ جلد چارج نہ لینے کی وجہ سے وائیں مجھ سے سخت ناراض تھا اور اس کا اظہار ان دونوں دوستوں سے بھی کر چکا تھا جنھیں وہ مذاق میں ''نبواں دا جوڑا'' کہا کرتا تھا۔ ان کو پسند بھی بہت کرتا تھا کیونکہ وسیع تجربے کی بنا پر یہ اسے مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ دونوں میرے بھی دوست تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں اسے علیحدہ مل کر اپنی پوزیشن واضح کر دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ۷۰ء میں ڈی سی لائل پور خالد محمود چیمہ نے ایک نصیحت کی تھی جسے میں نے گرہ سے باندھ لیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا

Never offer an explanation in life unless you are asked

---- to ملک سلیم اقبال اور چوہدری اقبال گہرے دوست تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں سدا بہار وزیر تھے۔ حکومت کوئی بھی ہوتی یہ اپنا الو کسی نہ کسی طور سیدھا کر لیتے۔ ملک صاحب تو میرے ''گرائیں'' تھے۔ چوہدری اقبال سے بھی خاصا یارانہ تھا۔ میں نے اُن کا ایک مختصر خاکہ لکھا تھا جس کا اجمالاً ذکر قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرے گا۔

شعروں کے انتخاب نے اُدھیڑا کیا مجھے:
چارج لیا ہی تھا کہ بار کے سیکرٹری نوید احمد نوید تشریف لے آئے۔ وہ کسی تعارف کے محتاج نہ تھے۔ نامور شاعر تھے، لیکن صرف شاعری ہی ذریعہ عزت نہیں تھا۔ جب سے گوجرانوالہ بار بنی تھی وہ اس کے مسلسل سیکرٹری منتخب ہوتے چلے آ رہے تھے اور غالباً دم واپسیں تک اس منصب کے ساتھ چمٹے رہنے کا ارادہ تھا۔ کہتے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اب کسی اور کو موقعہ دوں لیکن یہ نیک بخت (وکیل) بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ پچھلی بار تو بھوک ہڑتال کی دھمکی تک دے ڈالی۔ اب ڈی سی صاحب آپ ہی انصاف فرمائیں اس میں بدنامی کس کی ہوگی؟ بار کی! ان نیک بختوں نے بھوک ہڑتال کر کے کالے کوٹ پہن کر پھٹوں پر بیٹھ تو جانا ہے لیکن چوری چھپے کھانے پینے سے باز نہیں آنا۔ آخر انسان ہیں، ساتھ پیٹ لگا ہے پتہ نہیں گاندھی کیسے بھوک ہڑتال کر لیتا تھا۔ شاید یہی فرق ایک انسان اور مہاتما میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اگلے روز بار سے خطاب کی دعوت دے ڈالی۔ اگر نہ بھی آتے تو میرا جانا بنتا تھا۔ بار روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وکیل تقریر سننے سے زیادہ ڈپٹی کمشنر کو تولتے ہیں۔ کس قماش کا آدمی ہے مزاج کیسا پایا ہے۔ Judicial Acumen کتنا ہے؟ شخصیت کیسی ہے وغیرہ۔ تقریر کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ ہوتا ہے اور ناتجربہ کار افسر کی بھد بھی اُڑتی ہے اور آئندہ کے لئے تعلقات کار کا طریقہ بھی وضع ہو جاتا ہے۔ جو افسر بار کی میزان پر پورا اُتر جائے اور تلخ سوالوں کا جواب بھی خندہ پیشانی اور حکمت عملی سے دے، اس کا وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ گو یہ اصطلاح اب خاص گھس پٹ چکی ہے کہ بار اور بنچ گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ان کے بغیر گاڑی چل نہیں سکتی۔ اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے رُک جائے تو اس کا نقصان عوام کو زیادہ ہوتا ہے۔

نوید احمد نوید نے میرا مختصر سا رسمی تعارف کرایا اور پھر مجھے خطاب کی دعوت دی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ایم اے کے علاوہ میں لاء گریجویٹ بھی ہوں تو انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس سے اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا لیکن اصل حیرت اور خوشی اس وقت ہوئی جب میں نے ہر چند فقروں کے بعد شعر پڑھنا شروع کیے تو سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ تقریر ختم ہوئی تو کوئی سوال جواب نہ ہوئے۔ سب نے صرف ایک بات کہی ''ڈی سی صاحب! آپ نے ہمارے سیکرٹری کی بولتی بند کر دی ہے۔ اس کو اپنی شعر گوئی پر بڑا ناز تھا اور ہمیں وقت بے وقت مرعوب کرتا رہتا تھا۔ اب اسے پتہ چلے گا کہ ہر فرعون شاعر کے ساتھ ایک موسیٰ ماہر بھی ہوتا ہے۔''

بات لطیف پیرائے میں ہو رہی تھی لیکن جب نوید مجھے دفتر تک چھوڑنے آیا تو پھٹ پڑا۔ ''ڈی سی صاحب آپ نے بڑا ''دھڑو'' کیا ہے۔ پہلے ڈی سی کی طرح میں آپ کو بھی ''کورا'' سمجھ بیٹھا تھا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ نے تقریر کو اشعار سے مزین کر رکھا ہے تو میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ بزرگ شاعر دوست فرما گئے ہیں کہ کسی پر شعر و شاعری کے مقابلے میں بھروسہ نہ کرنا۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''نوید! دل چھوٹا نہ کرو اور بڑے مواقع آئیں گے جہاں تم اپنی شاعری کے جوہر دکھا سکتے ہو۔ ویسے بھی تمہارا اور میرا کیا مقابلہ! تم شعر خود لکھتے ہو میں دریوزہ گر آتش بیگانہ ہوں۔ مانگے تانگے کی آگ پر گزارا کرتا ہوں۔''

بولا ''آپ میری برادری کو نہیں جانتے۔ وہ کسی نے درست ہی کہا ہے کہ ''فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن'' اب میں ہزار غزلیں سناؤں چاہے رد و کی ہی کیوں نہ بن جاؤں یہ بس سے مس نہیں ہوں گے۔ بالفرض میں اگلا الیکشن ہار گیا تو مورد الزام آپ کو ہی ٹھہراؤں گا۔

یوم حمید نظامی: نوید نے بات تو مذاق میں کی تھی لیکن شاید درست ہی کہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد گوجرانوالہ میں یوم حمید نظامی منایا گیا۔ نوائے وقت کے بیورو چیف اعجاز میر نے جناب مجید نظامی، عارف نظامی، ڈاکٹر جاوید اقبال اور مشاہد حسین کو مدعو کیا۔ مجھے بھی بولنا تھا۔ افضل حسین تارڑ نے بتایا کہ وکلا عدالتوں میں تاریخیں لے رہے ہیں مبادا ڈی سی کی تقریر مس نہ ہو جائے۔ میری نظامی صاحب سے پہلی ملاقات وہیں پر ہوئی۔ ہر مقرر حمید نظامی کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ میں نے بھی تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے حوالے سے ان کی خدمات کو سراہا۔ استحکام پاکستان کے لئے مجید نظامی صاحب کی کوششوں، کاوشوں اور قربانیوں کا ذکر کیا۔ کیسے ایک شخص زندگی کی پل صراط پر ایک طویل عرصہ تک استقامت کے ساتھ چلا ہے۔ ہزار راہ مغیلاں تھے کارواں کے لئے، کئی فریب کے عشوے تھے امتحاں کے لئے، قدم قدم پہ بڑی سختیاں تھیں جاں کے لئے۔ فوجی افسروں کی دھمکیاں، اخبار کی بندش، مخالفین کی روش اور تنقید، کچھ بھی تو اس کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکا۔ حمید نظامی کا ذکر آزادی کی جدوجہد کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوستوں اور اغیار کا ذکر چھڑا اور بات مولانا آزاد تک جا پہنچی۔ مولانا نے جیل کی تنہائیوں میں غبار خاطر لکھی۔ اس میں سبز چائے کا ذکر بار بار کیا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے رسیا تھے اور پورا فنجان چسکیاں لے کر پی جاتے تھے۔ کالی چائے کے سخت خلاف تھے۔ وہ اس کے اتنے ہی مخالف تھے جس قدر قائداعظم کے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ''یہ ایک بہت بڑا فراڈ تھا جو انگریزوں نے ہندوستانیوں پر روا رکھا۔ سبز چائے تو پیدا کر نہ سکے ایک جڑی بوٹی کو بلیک ٹی کا نام دے ڈالا۔ اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس میں دودھ کی کثافت بھی ملا ڈالی۔'' آخر میں رقمطراز ہیں کہ ''میں نے بڑی کوشش کی کہ پنڈت جواہر لعل نہرو وہ لیجپو پیجپو قسم کی

چائے پینا چھوڑ دیں لیکن پنڈت جی نے ان کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔" یہاں پر میں نے ایک نکتہ نکالا۔ پنڈت جی نے انہیں کبھی بھی سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ جبھی تو قائداعظم انہیں شو بوائے آف کانگریس کہا کرتے تھے۔ جو جواہر لعل ان کی منت سماجت کے باوصف چائے کی ایک پیالی سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا، وہ مسلم دشمنی سے کیسے پیچھے ہٹتا۔ مولانا کے پاس کون سا نشتر تھا جس سے نہرو کے رگ وپے میں سرایت شدہ مسلم دشمنی کا زہر نکال سکتے۔ اس لئے اگر ان کی کتاب India wins freedom پڑھیں تو تاسف کے سائے اس کی شخصیت پر صاف پڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بین السطور ذہن میں صرف ایک ہی تاثر اُبھرتا ہے۔

"میں پشیماں ہوں، پشیماں ہے میری تدبیر کی"

اندلس کے خلیفہ معتمد کی طرح شاید غالب بھی اسی لئے کہہ گیا تھا "ہائے اس زود پشیمان کا پشیماں ہونا"۔ تقریر ختم ہوئی تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ مشاہد حسین کہنے لگے "میں نے زندگی میں کسی ڈپٹی کمشنر سے ایسی تقریر نہیں سنی۔"

عارف نظامی کی حیرانی کی وجہ اور تھی۔ بولے "آپ میرے والد صاحب کو کبھی نہیں ملے۔ ان کی تحریریں بھی کم کم پڑھی ہوں گی۔ پھر ایک گھنٹہ تک ایسی جاندار تقریر کیسے کر ڈالی۔"

بڑے میاں، چھوٹے میاں.....؟ میں سامان لینے ملتان گیا۔ رات کو جنرل ترغدی نے کھانا کیا تھا۔ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ کمشنر کا پیغام آیا فوراً پہنچو۔ صبح وزیراعظم فاتحہ خوانی کے لئے کاموکی آ رہے ہیں۔ میں نے ساری رات سفر کیا۔ لاہور میں تھوڑی دیر کے لئے رُکا اور سیدھا ہیلی پیڈ پہنچ گیا۔ میاں نواز شریف کے آنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ کاموکی شہر سے تین میل کے فاصلے پر ایک پرسکون جگہ پر کمشنر نے ہیلی پیڈ بنوایا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔

عرض کیا "یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ میاں نواز شریف سخت ناراض ہوں گے۔ ہیلی پیڈ شہر کے اندر ہونا چاہئے تھا۔"

کہنے لگے "آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔ ایک گھر میں مرگ ہو گئی ہے۔ وہ افسوس کرنے آ رہے ہیں کسی سیاسی جلسے میں شرکت کرنے یا دعوت ولیمہ میں نہیں آ رہے۔ چونکہ بڑا Solemn occasion ہے اس لئے موقعہ کی مناسب سے ہیلی پیڈ بھی یہاں بنوایا ہے۔" ہیلی پیڈ تو بن ہی چکا تھا میں خاموش ہو گیا۔

جب میاں صاحب کاپٹر سے اُترے تو اُن کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ کمشنر نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انھوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ غصے سے بولے "کمشنر صاحب آپ نے یہ کیا کیا ہے۔ مجھے جنگل میں اُتار دیا ہے۔ ہم عوامی آدمی ہیں عوام کہاں ہیں۔ کیا وزیراعظم کا اسی طرح استقبال کرایا جاتا ہے۔" وہ گاڑی میں بیٹھے اور کاموکی روانہ ہو گئے۔

کامران رسول کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا اور وہ بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزنے لگا۔ شاید اسے اپنے تبادلے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی سبکی ماتحت عملے کے سامنے ہوئی تھی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

زبان سے کچھ نہ بولا۔ شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔
میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ جب وزیر اعظم واپس جائے گا تو آپ کا کاندھا تھپتھپا کر جائے گا۔"
آدھے گھنٹے میں ہم نے ہیلی پیڈ شہر کے سکول گراؤنڈ میں منتقل کر دیا۔ گراؤنڈ گرد و غبار اور غلاظت سے اٹا پڑا تھا۔ میونسپل کمیٹی کے سب خاکروبوں کو بلا کر صفائی کروائی۔ فوجی پالشس کی منت سماجت کر کے انہیں وہاں جانے پر راضی کیا۔
میاں صاحب ڈیڑھ گھنٹہ رانا وکیل کے ڈیرے پر بیٹھے۔ جب واپس آئے تو عجیب منظر دیکھا۔ سارا شہر گراؤنڈ میں جمع ہو گیا تھا۔ چار سُو نواز شریف زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اس وقت سٹیج تو نہ بن سکتی تھی لیکن ہم نے میگافون کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میاں صاحب نے حسب ضرورت تقریر کی اور خوش ہو کر شہر کے لئے چالیس لاکھ کی گرانٹ کا اعلان کر دیا۔ جانے سے پہلے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔
اظہر حسن ندیم سکھ کا سانس لے کر بولے
"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت"
"ابھی پوری طرح بلا ٹلی نہیں ہے۔ چھوٹے میاں صاحب سیلاب زدگان کی فہرستیں دیکھنے پنڈی بھٹیاں پہنچ گئے ہیں اور سب کو یاد فرمایا ہے۔" ملک اقبال بولا۔
ہم بھاگم بھاگ جب پنڈی بھٹیاں سے ملحقہ گاؤں میں پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ سارا گاؤں باہر چوپال میں کھڑا تھا۔ ایک چارپائی پر اے سی پنڈی بھٹیاں اقبال باجوہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کھڑا جھول رہا تھا اور شہباز شریف قریب کھڑے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے۔ وجہ؟ ایک بوڑھی عورت نے شکایت کی تھی کہ اس کا گھر بھی سیلاب سے متاثر ہوا ہے لیکن اے سی نے ضعیفہ کا نام معاوضہ لسٹ میں درج نہیں کیا۔
اپنے اے سی کی یہ درگت بنتے دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے چارج لے کر سب سے پہلا دورہ اُسی گاؤں کا کیا تھا۔ اس دن بھی اس عورت نے اے سی کی شکایت لگائی تھی۔ میں اس کے گھر گیا تو مکان صحیح سلامت تھا۔ محض پیسے کی خاطر اس نے جھوٹی شکایت لگائی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سارے گاؤں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ سچ بتا سکتا۔ اے سی کی زبان میں بھی لکنت آ گئی تھی۔
شہباز شریف کہنے لگے "ڈی سی صاحب! یہ ہے آپ کی ایڈمنسٹریشن۔ یہ موٹا شخص ایک غریب بیوہ کی داد رسی نہیں کر سکتا۔"
"یہ جھوٹ بولتی ہے" میں نے کہا "میں نے اس کا گھر خود جا کر دیکھا ہے۔ اس کی ایک اینٹ بھی نہیں اُکھڑی۔ آپ خود چل کر کیوں نہیں دیکھ لیتے۔" میرا یہ کہنا تھا کہ سب گاؤں والے بول پڑے۔ یہ حرافہ جھوٹی اور مکار ہے۔ ہر افسر کے سامنے جھوٹے ٹسوے بہاتی ہے۔
شہباز شریف کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ اے سی کو ہاتھ کی انگلی سے چارپائی سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا اور بغیر کسی معذرت یا تاسف کا اظہار کئے بولا "تمہارا وزن بہت بڑھ گیا ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو۔"

[جاری ہے۔]

بکھرا وا

ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا
پیکرِ گل یک بہ بک سینہ کشا کیسے ہوا

کرچیوں کے رنگ میں بکھرا ہوا انسان تھا
ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا

دل کا ہر ٹکڑا ، مثالِ آئینہ حیران تھا
ریزہ ، ریزہ ، اک مکمل آئینہ کیسے ہوا

ایک پل کی بھول تھی اور فرش پر گلدان تھا
پیکرِ گل یک بہ بک سینہ کشا کیسے ہوا

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر گام ہے مرحلوں کی منزل
یک رنگ تمام راستے ہیں

وھن

(غزا کے ہسپتال میں بڑی تکلیف میں مبتلا ایک بچے نے ڈاکٹر سے پوچھا، ڈاکٹر کیا میں زندہ ہوں؟ ___ ایک خبر)

وھن اک بیماری ہے
موت کے ڈر کی بیماری
جس سے ہم سب مرے ہوئے ہیں

جیسے ہم نے گھروں میں بیٹھے مرنا نہیں ہے
جیسے دروازے پر دستک دیتی موت نے آپ پلٹ جانا ہے
ہم یہ سوچ کے موت کے اس منظر نامے سے
پرے ہوئے ہیں
اوروں کو آوازیں دیتے
اندر سے ہم ڈرے ہوئے ہیں

چاروں جانب راکٹوں کی آوازیں دل کو دہلاتی ہیں
زندگی بھر کی بے عملی سے سوکھے ہوئے جو نخل ہیں
خوابوں میں کب ہرے ہوئے ہیں؟

''بیٹا! تو آواز یہ کس کو دیتا ہے
تُو تو زندہ ہے
ہم سارے ہی مرے ہوئے ہیں''

ریاض مجید

عداسؓ

تجھے سلام!
اے انگوروں کے شیریں خوشوں سے لہکتی ڈالی!
اے طائف کے باغ کے مالی!
لہولہو منظر،
پتھریلے موسم،
وحشی جذبوں
اور سُلگتے لمحوں میں
گھائل بدنوں کے اور غریب الوطنوں کے دمسازِ عالی!
پتھر برستانی بستی کے خنک مقالی!

میں نے تجھے
آقاؐ کے حضور سخن کرتے،
دم بھرتے،
محبت کرتے دیکھا ہے
حسنِ عقیدت سے آقاؐ کے ہاتھ اور پاؤں چومتے،
وادیِ عشق میں گھومتے دیکھا ہے
دلجوئی کی گیلی ساعتوں میں
اکرام و تواضع کرتے،
صورتِ بادِ شمال گزرتے
زینۂ چارہ گراں سے اُترتے دیکھا ہے

اے طائف کو شہرِ سنگ زماں کہنے والو!
میری آنکھوں سے اِس شہر کو دیکھو

میرا طائف

بدن دریدہ،
دِل اَفگاروں اور جان پُرسوزوں کا لباس ہے
کُوئے سپاس ہے
دائرۂ ہستی کا رداس ہے
بوسہ گاہِ عداسؓ ہے
بوسہ گاہِ عداسؓ ہے

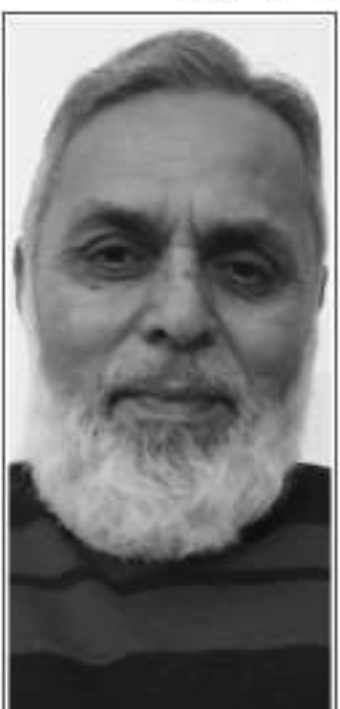

محمد انیس انصاری

زندگی اے زندگی

جسم سے محروم جاں ہے زندگی اے زندگی
ہم تجھے لائیں کہاں سے زندگی اے زندگی

لے گئے ہیں ساتھ ہنگامے سبھی جاتے ہوئے
رونقیں تھیں رفتگاں سے زندگی اے زندگی

جن کے دم سے روز و شب میں رنگ رعنائی کے تھے
اٹھ گئے وہ درمیاں سے زندگی اے زندگی

ہر مسافر کی ہیں آنکھیں نم گرفتہ رنج سے
کون بچھڑا کارواں سے زندگی اے زندگی

بے ثمر لمحات جن کے بخت میں لکھے گئے
ان کے دن ہیں رائیگاں سے زندگی اے زندگی

تھی گھنیری چھاؤں لیکن باپ کی رخصت کے بعد
دھوپ الجھی سائباں سے زندگی اے زندگی

چھین لی ہیں لوریوں جیسی دعائیں وقت نے
کون ملوائے گا ماں سے زندگی اے زندگی

دست و بازو تھے جواں بھائی اچانک چل بسے
دل گیا تاب و تواں سے زندگی اے زندگی

فاختائیں گر رہی ہیں اور یہ کھلتا نہیں
تیر آئے کس کماں سے زندگی اے زندگی

بن گیا جن سے جہنم دہر اُن پر بھی کبھی
قہر ٹوٹے آسماں سے زندگی اے زندگی

گلزار بخاری

تعفّن

تو کیا جتاتے ہو تم
جو اگربتی کی دھونی کو بھی
فطری خوشبوؤں پر اس قدر ترجیح دیتے ہو!

تمہاری اس اگربتی کی دھونی سے اُٹے
ماحول میں
سانسوں کے زیر و بم----
معطل ہیں۔

یہ سانسوں کے معطل زیر و بم----
ان بند کمروں میں پڑے،
اپنی بحالی کے لئے ایسے دُعاگو ہیں
کہ سب سرگوشیاں،
خاموشیوں کا روپ دھارے گڑگڑاتی ہیں،
مگر خاموشیوں کے گڑگڑانے کی صدائیں
کون سنتا ہے؟

یہ سب سانسوں کے زیر و بم----،
زباں سے بولنے کا جب کبھی سوچیں
تو سر چکرانے والے
عطر اور لوبان کی خوشبو میں ڈوبی
اک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

کوئی بارِیش اندیشہ،
مسلسل بڑبڑاتا ہے----

جلالی، سرخ آنکھیں، سرخ تر ہو کر
گلوں کی خوشبوؤں کو بھی،
انہی سانسوں کے زیر و بم کی لے پر صرف مرنے کا کہتی ہیں۔

اگربتی کی صورت
جب دہکتی سرخ آنکھیں بھی
زباں پر آگ باندھے ہوں،
تو سانسوں کی مجال اتنی کہاں کہ گڑگڑا
پائیں۔

اگر یہ گڑگڑائیں بھی
تو خود، ان کی صدائیں
ان کے کانوں تک نہیں آتیں----

سبب اس کا ہمیں معلوم ہے
لیکن
مگر چھوڑو----

چمن کی خوشبوؤں سے جس جگہ پرہیز کی
تلقین ہوتی ہو،
جہاں کی خوشبوؤں میں سانس لینے کی
ہماری خواہشیں----
کافور ہو جائیں،
جہاں لوبان کا دورِ حکومت ہو،
وہاں ان فطری خوشبوؤں کے
دم گھٹنے کا نوحہ کون لکھے گا۔

رانا سعید دوشی

نظم

تم میرے ہو، تم میرے ہو
چاہے جو بھی موسم ہو
چاہے کوئی منظر ہو
چاہے کوئی شہر ہو میرا
چاہے جس خطے میں جا کر
تم بس جاؤ
لیکن میرے دل کو یقیں ہے
تم میرے ہو، تم میرے ہو
چاہے دنیا
جتنی مرضی سازش کر لے
وقت کا دریا
چاہے ہم کو دور بہا کر لے جائے
اور
ان دیکھے ساحل پر جا پھینکے
اور کبھی ہم مل نہ پائیں
پھر بھی میرے دل کو یقیں ہے
جیون بھر تم میرے رہو گے
کیونکہ میرے دل کو یقیں ہے
تم میرے ہو

افتخار شوکت

میں اور مٹی کا آدمی ہُوں

میں اور مٹی کا آدمی ہُوں
بکھر بھی جاؤں
تو میری ہستی کا کوئی ذرہ
قضا کی اندھی گھپا میں گرتے
مرے بدن کے تمام پُرزے
سمیٹ لائے
نئے عزائم کی آنچ دے کر
شکستگی کے نشاں مٹائے
نئے سرے سے مجھے بنائے
انس کی ضربِ فنا بھی مجھ میں
نمودِ نَو کا پیام پائے
مرے عدو !
یہ خیال رکھنا
کہ حرف و نقشِ غلط کی صورت
مجھے مٹانا نہیں ہے ممکن
جدا ہے فطرت میں خاک میری
میں اور مٹی کا آدمی ہُوں

ظفر علی راجا

نظم

عجیب مافوق سلسلہ تھا
شجر جڑوں کے بغیر ہی
اگ رہے تھے
خیمے، بغیر چوبوں کے
اور طنابوں کے آسرے کے
زمیں پر استادہ ہو رہے تھے
چراغ، لو کے بغیر ہی
جل رہے تھے
کوزے، بغیر مٹی کے
چاک پر ڈھل رہے تھے
دریا، بغیر پانی کے
بہ رہے تھے
سبھی دعائیں گرفتہ پا تھیں
رکی ہوئی چیزیں قافلہ تھیں
پہاڑ، بارش کے ایک قطرے سے
گھل رہے تھے
بغیر چابی کے، قفل
از خود ہی کھل رہے تھے
نڈر پیادہ تھے
اور بزدل اصیل گھوڑوں پہ بیٹھ کر
جنگ لڑی رہے تھے
گناہ گاروں نے سر سے پا تک
بدن کو براق چادروں سے
ڈھکا ہوا تھا
ولی کی ننگی کمر چھپانے کو
کوئی کپڑا نہیں بچا تھا
عجیب مافوق سلسلہ تھا!

سید تحسین گیلانی

خوفِ اَحوال

آج کا دن تو گزر گیا ہے کل کی بابت سوچ رہا ہوں
میں اندھیارے گھر میں بیٹھا روشن گلیاں دیکھ رہا ہوں
میں منحوس شبوں کا عادی سورج سے بھی خوف زدہ ہوں
روشن صبحیں میرے ہر اک راز کو افشا کر دیں گی

میں اپنے شفاف بدن کو ایسے تھام کے بیٹھا ہوں
جیسے تیز ہوا کا جھونکا سب کچھ چھین کے لے جائے گا
اور غیرت، ناموس سبھی کچھ مٹّی میں مل جائے گا

میں اندھیارے گھر کا باسی، میں منحوس شبوں کا عادی
لمحہ لمحہ پھیلتے دن کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہوں

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کُھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا ، مجھے حیران رکھنا

غزہ کے لیے کچھ اشعار

غم غزہ کا حرزِ جاں ہے آج کل
زندگی محو فغاں ہے آج کل

دیکھ کر ظلم و ستم اس ارض پر
درد بھی نوحہ کناں ہے آج کل

سینکڑوں مسلم ممالک ہیں مگر
بے نیازی بیکراں ہے آج کل

جس کو کہتے ہیں زمین انبیاء
موت کا منظر وہاں ہے آج کل

وہ نگر جو ہر گھڑی تھے مستعد
بستۂ خوابیدگاں ہے آج کل

کب تھے مسلم حکمراں شیر و شکر
جسکو دیکھو سرگراں ہے آج کل

کون میدان وغا میں ساتھ دے
جو بھی ہے بس سرگراں ہے آج کل

ہر طرف لاشیں ہیں معصومین کی
ہائے منظر خوں چکاں ہے آج کل

تھا غزہ میں بھی سکوں پرآب وہاں
ہر مسلماں بیاباں ہے آج کل

جو زمیں تھی قصر عاصیؔ نور کا
ظلمتِ سیارگاں ہے آج کل

مرزا عاصی اختر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

آؤ ماتم کریں

ایک نقصان کا
اپنے اندر ہی مرتے ہوئے ایک انسان کا

ایک عہدِ ازل
جس پہ سب نے ہی بازو اٹھا کر کہا تھا: بلیٰ
اس کے مرنے پہ پرسہ بھی دینے کو کوئی نہیں

آؤ ماتم کریں
قتل ہوتی ہوئی ایک تہذیب کا
سچ کی تکذیب کا

اپنے آزاد ہونے نہ ہونے پہ دل میں نہاں
اک ندامت کا ماتم کریں
خود ہی مظلوم ہیں
خود ہی ظالم ہیں ہم
اپنے مرنے پہ خود ہی عزادار ہیں
ساتھ یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں ہم

کس لئے
پھر بھی شہ کے وفادار ہیں
آؤ ماتم کریں

ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اگر
لب پہ جنبش نہیں
آؤ ماتم کریں

صغیر احمد صغیر

نئے سال کا شور

دُھند ہے
نئے سال کے نتھنوں میں
آنکھوں میں
بے یقینی کے کینچوے
لامحدود خواہشات کے ببول
سموگ کی زہریلی فضا میں
فشارِ خوں کا حصہ ہیں
کون ہے
جو دستک دیتا رہتا ہے
دل میں
کیا کوئی اور
شاید کوئی بھی نہیں!
کوئی تو ہے
جسے خواب کا چہرہ
پہاڑ کے اُس پار سے بھی
نظر آتا ہے
لیکن ایسا کچھ بھی نہیں
محض کلنڈر کا رُخ بدلتا ہے
اور ایک آدھ عدد
تبھی تو
اُمید قہقہے لگاتی ہے
رات کی
بھیانک مایوسی کا طنز
جسموں میں ڈنک کی طرح چبھتا ہے
حصارِ جسم و جاں کی فضا میں
یہ کیسی
جبر کی دُھند ہے
اور پھر
سموگ کا زہر تو
میرے کمرے تک آ گیا ہے
اور وہ
آسمانی چاند بھی
شاید گدلا۔۔۔ اتنا میلا کیوں ہے؟

امجد بابر

.....مڈل کلاس.....

خرید لائی ہو کوٹ مہنگا۔۔۔تو اِس کو پہنو
حسین لڑکی!
جو آج لمحہ گزر رہا ہے وہ کل نہ ہوگا
پُرانی کیبنٹ میں اَن چُھوئے یہ لباس کب
تک پڑے رہیں گے؟
رہیں گے مصرف میں عام کب تک؟
یہ خاص کب تک دھرے رہیں گے؟
رسوئی خانے میں بیش قیمت ظروف کب سے
پڑے پڑے یوں تمہارے ہونٹوں کے ذائقے
کو ترس گئے ہیں
انہیں نکالو صندوقچوں سے
ڈنر کی ٹیبل سجائی لاکر
جو جی میں آئے بنائی لاکر
یہ کیا کہ اس پل کی خوش لباسی کو وقتِ مبہم پہ ٹال دینا
یہ کیا کہ مہنگا یہ عطر و غازہ
فلاں ضیافت، فلاں مدارت، فلاں کی خاطر سنبھال دینا
کبھی تو سانسوں کے ساتھ بہتی یہ ساعتیں بھی منا کے دیکھو
چلو یہ خوشبو لگا کے دیکھو !!!
کہ آج کا دن گزر گیا تو
نہیں ملے گا
حسین لڑکی!!

عاطف جاوید عاطف

نثری نظم

بھولنے کے لئے فاصلہ شرط نہیں
ہم ساتھ رہتے ہوئے بھی فراموشی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں

اداسی دل میں گھر کر لے تو
آنگن سونا لگتا ہے
خامشی تکلم کو کھا جاتی ہے
لفظ کھو جائیں تو جذبے گونگے ہو جاتے ہیں
احساس مر جائے تو آنکھیں پہچان کھو دیتی ہیں

ہم ساتھ رہتے ہوئے بھی صدیوں کے فاصلوں پر لگتے ہیں

فاصلہ جتنا طویل ہو یادیں اتنی دھندلی ہو جاتی ہیں
اپنے گماں میں مقید ہم اتنی دور جا نکلتے ہیں کہ واپسی کا رستہ نہیں ملتا

اک دوسرے کو بہت زیادہ جاننا بھی اک دوسرے سے خائف کر دیتا ہے
ہم جب بھی ملیں پہلے سے زیادہ اجنبی لگتے ہیں
لگتا ہے فراموشی کے سفر کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا
بھولنے کے لئے زمینی فاصلہ ضروری نہیں
کبھی کبھی قربتیں بھی جدائی کا سبب بن جایا کرتی ہیں
تعلق کے مابین
ذہنی دوری سے بڑی کوئی خلیج نہیں
ہم ساتھ ہوتے ہوئے بھی
ساتھ نہیں ہوتے

نائلہ راٹھور

ہم، جو کچھ نہیں

ہم نے بچپن غباروں میں پھونکا
تو ششدر نگاہوں سے ہم
اس کو پھٹتے ہوئے دیکھتے رہ گئے
ہم نے تاریکیوں کا سفر
روشنی کی طرح چیر کر
چند لمحوں میں یوں کر لیا
کہ خلا بن گئے
وہ خلا جو مسلسل ابھرتے ہوئے
سورجوں کی نمائش میں مصروف ہے

ہم سرابوں میں رہتے مکیں
ایک پانی کے قطرے کو ترسے سبھی
دھوپ سے سہمے تکتے تھے اپنا بدن
ایک دن پانیوں میں ابال آ گیا
اور دریا کی بے رحم موجیں
ہمی کو بہا لے گئیں
کتنی بے رحم ہے زندگی

ہم کو گلوں کی صورت میں ہانکا گیا
راہ داری میں اُگتی ہوئی گھاس کھانے
سے روکا گیا
پھول چنتے ہوئے خار لگنے سے جو خون ٹپکا
تو سردی کے مارے ہمارا ہی خوں جم گیا
ہم کہ لوحِ ازل پر نہیں
ہاں مگر ہیں تو کیا ہیں؟
نہیں جانتے۔۔!

زاہد خان

فنا کے بعد

مجھے تمہاری طلب ہے جاناں
کہ بند آنکھیں جو منتظر ہیں
کئی رتوں سے کہ کوئی آئے
سب عجلتوں کو وہ مہلتوں میں
بدل ہی ڈالے
جو عاقبت ہے جو مصلحت ہے
تیاگ کر ہم کہیں ملیں تو
یہ بھول جائیں
کہ گرد اپنے
زمین نامی
کوئی سیارہ
ہے، بھول جائیں
کہ آسماں سے زمیں کی جانب
سفر کیا تھا
کبھی کیا تھا، یہ بھول جائیں
یوں ہو کے اک دوسرے
میں مدغم
یہ بھول جائیں
کہ ہم نے اپنے وجود میں بھی
کبھی جیا تھا
یا مانندِ گل وجود بخشیں
نئے گلوں کو
یا بہتے جائیں سیال بن کر
سمندروں میں
یا پھر ہواؤں کے سنگ اڑیں ہم
جو کچھ نہ ہوگا
تو آگ بن کر جلا کریں گے
بجھا کریں گے

☆☆☆☆☆

رافعہ ارم مرزا

سلامت رہو

سنو!

سلامت رہو

میٹھے بول کے خریدار

ہو تم

بیوپاری بنے رہنا

تمھاری مجبوری ہے

سنو!

سلامت رہو

میٹھے بول کے خریدار ہو تم

محمد عبداللہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پالنوں کی عُمروں سے اب ہمیں نکلنے دے
خاک میں لتھڑنے دے پاؤں پاؤں چلنے دے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عکسِ نظر اور ہو ، پیشِ نظر اور ہو
ایک سفر ہو چکا ، ایک سفر اور ہو

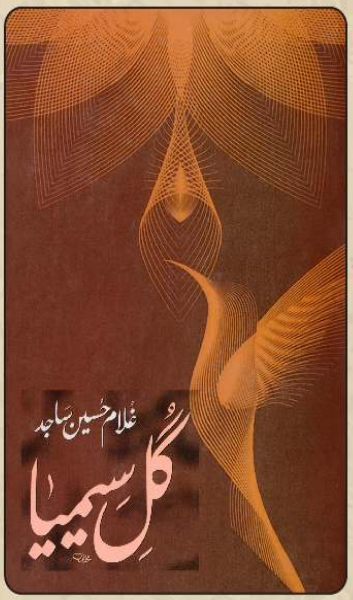

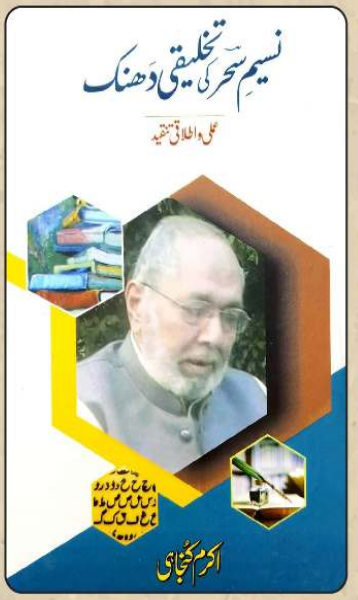

نسیمِ سحر کی تخلیقی دھنک
عملی و اطلاقی تنقید
اکرم کنجاہی

غلام حسین ساجد
گلِ سیمیا

کتنے موسم خواب ہوئے
کتنے موسم خواب ہوئے
طارق بٹ

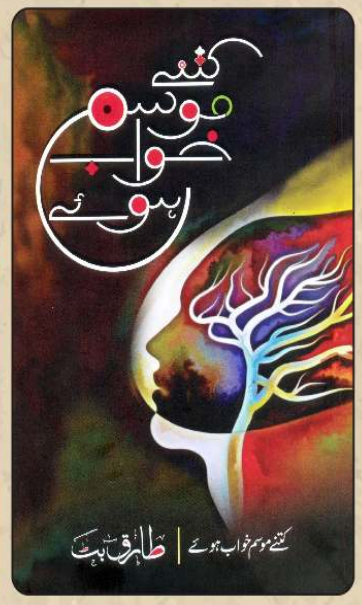

(ناول)
یہوہ
علی نواز شاہ

جناب غافر شہزار، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب احمد فراز، جناب منظر حسین اختر

جناب غافر شہزار، جناب پروفیسر ڈاکٹر خواجہ ذکریا

جناب پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب غافر شہزار